بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6892

سورۃ الملک (67)

آیت نمبر (1 تا 5)

ط	ب	ق

(س) طَبَقًا بادل کا فضا کو ڈھانپ لینا۔ عمارت کی منزل کے اوپر اور منزل ہونا۔

طَبَقٌ اسم ذات بھی ہے۔ کسی چیز کے اوپر کی چیز۔ منزل کے اوپر کی منزل۔ ﴿ لَتَرۡکَبُنَّ طَبَقًا عَنۡ طَبَقٍ ﴿۱۹﴾ ﴾ (84/الانشقاق:19) ''تم لوگ لازماً چڑھو گے ایک منزل پر ایک منزل سے۔''

(مفاعلہ) طِبَاقًا مُطَابَقَةً (۱) ایک چیز کا دوسری کے مطابق ہونا۔ (۲) ایک جیسی چیزوں کا ایک دوسرے کے اوپر ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔3

ترجمہ

تَبٰرَکَ الَّذِیۡ	بِیَدِہِ	الۡمُلۡکُ ۫	وَہُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ	قَدِیۡرُۨ ﴿۱﴾
بابرکت ہوئی وہ (ذات)	جس کے ہاتھ میں	ساری بادشاہت ہے	اور وہ ہر چیز پر	قدرت رکھنے والا ہے

الَّذِیۡ خَلَقَ	الۡمَوۡتَ وَالۡحَیٰوۃَ	لِیَبۡلُوَکُمۡ	اَیُّکُمۡ اَحۡسَنُ
جس نے پیدا کیا	موت کو اور حیات کو	تاکہ وہ جانچے تم لوگوں کو (کہ)	تم لوگوں کا کون زیادہ اچھا ہے

عَمَلًا ؕ	وَہُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡغَفُوۡرُ ﴿۲﴾	الَّذِیۡ خَلَقَ	سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ	طِبَاقًا ؕ
بلحاظ عمل کے	اور وہ ہی بالادست ہے بے انتہا بخشنے والا ہے	جس نے پیدا کیا	سات آسمانوں کو	تلے اوپر ہوتے ہوئے

مَا تَرٰی	فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ	مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ	فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ
تو نہیں دیکھے گا	رحمان کی تخلق میں	کسی طرح بھی ہم آہنگ نہ ہونا	پس تو لوٹا بصارت کو

ہَلۡ تَرٰی	مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾	ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ	کَرَّتَیۡنِ	یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ
کیا تو دیکھتا ہے	کچھ بھی شگاف	پھر تو لوٹا بصارت کو	دوبارہ	تو پلٹ آئے گی تیری طرف بصارت

خَاسِئًا	وَّہُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾	وَلَقَدۡ زَیَّنَّا	السَّمَآءَ الدُّنۡیَا	بِمَصَابِیۡحَ
تھکی ماندی ہوتے ہوئے	اس حال میں کہ وہ ناکام ہوگی	اور بیشک ہم نے سجایا ہے	نزدیکی (دنیوی) آسمان کو	چراغوں سے

وَجَعَلۡنٰہَا	رُجُوۡمًا	لِّلشَّیٰطِیۡنِ	وَاَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ	عَذَابَ السَّعِیۡرِ ﴿۵﴾
اور ہم نے بنایا ان (چراغوں) کو	سنگسار کرنے کے ذرائع	شیطانوں کے لیے	اور ہم نے تیار کیا ان کے لیے	بھڑکتی آگ کا عذاب

نوٹ:1

حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ یہ سورۃ عذاب کو روکنے والی اور عذاب سے نجات دلانے والی ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے کو عذاب قبر سے بچائے گی۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

آیت۔2 میں ہے کہ اس نے پیدا کیا موت اور حیات کو۔ حیات کے لیے پیدا کرنے کا لفظ تو اپنی جگہ ظاہر ہے، کہ حیات ایک وجودی چیز ہے۔ لیکن موت جو بظاہر ایک عدم کا نام ہے، اس کے ساتھ تخلیق کا تعلق کس طرح ہوا۔ اس کے جواب میں ائمہ تفسیر سے متعدد اقوال منقول ہیں۔ سب سے زیادہ واضح بات یہ ہے کہ موت عدم محض کا نام نہیں ہے بلکہ روح اور بدن کا تعلق منقطع کر کے روح کو ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل کرنے کا نام ہے اور یہ ایک وجودی چیز ہے۔ غرض جس طرح حیات ایک حال (یعنی حالت) ہے جو جسم انسانی پر طاری ہوتا ہے، اسی طرح موت بھی ایک ایسا ہی حال ہے۔ (معارف القرآن)

اس دنیا میں انسانوں کے مرنے اور جینے کا یہ سلسلہ اس نے اس لیے شروع کیا ہے کہ ان کا امتحان لے کہ کس انسان کا عمل زیادہ بہتر ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں بہت سی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا ہے۔ اوّل یہ کہ موت اور حیات اسی کی طرف سے ہے، کوئی دوسرا نہ زندگی بخشنے والا ہے نہ موت دینے والا۔ دوسرے یہ کہ انسان جیسی مخلوق، جسے نیکی اور بدی کرنے کی قدرت عطا کی گئی ہے، اس کی نہ زندگی بے مقصد ہے نہ موت۔ خالق نے اسے یہاں امتحان کے لیے پیدا کیا ہے۔ زندگی اس کے لیے امتحان کی مہلت ہے اور موت کے معنی یہ ہیں کہ اس کے امتحان کا وقت ختم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ اسی امتحان کی غرض سے خالق نے ہر ایک کو عمل کا موقع دیا ہے تا کہ وہ دنیا میں کام کر کے اپنی اچھائی یا برائی کا اظہار کر سکے۔ چوتھے یہ کہ خالق ہی اس بات کا فیصلہ کرنے والا ہے کہ کس کا عمل اچھا ہے اور کس کا بُرا۔ اعمال کی اچھائی اور برائی کا معیار تجویز کرنا امتحان دینے والوں کا کام نہیں ہے بلکہ امتحان لینے والے کا کام ہے۔ اس لیے جو بھی امتحان میں کامیاب ہونا چاہے اسے یہ معلوم کرنا ہوگا کہ امتحان لینے والے کے نزدیک حسنِ عمل کیا ہے۔ پانچواں نکتہ خود امتحان کے مفہوم میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ جس کا جیسا عمل ہوگا اسی کے مطابق اس کو جزا دی جائے گی۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

(آیت 5۔7) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہی تارے شیطانوں پر پھینک مارے جاتے ہیں اور یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ شہاب ثاقب صرف شیطانوں کو مارنے ہی کے لیے گراتے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ تاروں سے جو بے حد و حساب شہابِ ثاقب نکل کر کائنات میں انتہائی تیز رفتاری سے گھومتے رہتے ہیں اور جن کی بارش زمین پر بھی ہر وقت ہوتی رہتی ہے، وہ اس امر میں مانع ہے کہ زمین کے شیاطین عالم بالا میں جا سکیں۔ اگر وہ اوپر جانے کی کوشش کریں بھی تو یہ شہابِ ثاقب انہیں مار بھگاتے ہیں۔

رہا یہ سوال کہ ان شہابیوں کی حقیقت کیا ہے، تو اس بارے میں انسان کی معلومات اس وقت تک کسی قطعی تحقیق سے قاصر ہیں۔ تاہم جس قدر بھی حقائق اور واقعات اب تک انسان کے علم میں آئے ہیں اور زمین پر گرے ہوئے شہابیوں کے معائنے سے جو معلومات حاصل کی گئی ہیں ان کے بناء پر سائنس دانوں میں سب سے زیادہ مقبول نظریہ یہی ہے کہ یہ شہابیے کسی سیارے کے انفجار کی بدولت نکل کر خلا میں گھومتے رہتے ہیں اور پھر کسی وقت زمین کی کشش کے دائرے میں آ کر ادھر کا رخ کر لیتے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (6تا14)

ترکیب

(آیت۔7۔8) اِذَا اور کُلَّمَا حرف شرط ہیں۔ اس لیے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ تَمَیَّزُ کی پہچان یہ ہے کہ نہ تو یہ تَمَیَّزَ (باب تفعل کا ماضی) ہے اور نہ ہی یہ تُمَیِّزُ (باب تفعیل کا مضارع) ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ باب تفعّل کا مضارع تَتَمَیَّزُ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔ خَازِنٌ کی جمع خَزَنَةٌ ہے۔ یہاں یہ سَئَلَ کا فاعل اسم ظاہر ہے اس لیے فاعل جمع ہونے کے باوجود فعل سَئَلَ واحد آیا ہے (آیت۔9) قَالُوْا سے پہلے کوئی حرف شرط نہیں ہے لیکن پھر بھی فعل ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا کیونکہ یہ قیامت کا بیان ہے۔ (دیکھیں آیت۔2۔27، نوٹ 3)۔ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ کَبِیْرٍ میں اِنْ کی بعد اِلَّا آ رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اِنْ نافیہ

ہے۔(آیت۔10)اس آیت کے مختلف ترجمے ممکن ہیں۔لَوْ کو شرطیہ (اگر) مان کر بھی ترجمہ ہوسکتا ہے اور اسے تمنی (کاش) مان کر بھی ترجمہ ہوسکتا ہے۔دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔اسی طرح کُنَّا نَسْمَعُ کو ماضی استمراری بھی مانا جاسکتا ہے اور کُنَّا کو فعل ناقص مان لیں تو اس میں شامل نَحْنُ کی ضمیر اس کا اسم اور نَسْمَعُ اس کی خبر ہوگی۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔(آیت۔11)سُحْقًا کسی فعل محذوف کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔(آیت۔14)اس کے بھی دو ترجمے ممکن ہیں، ایک یہ کہ اَلَا کو حرف تنبیہ (خبردار۔سن لو) مان کر ترجمہ کیا جائے۔دوسرے یہ کہ ہمزہ کو استفہامیہ (کیا) مان کر اور لَا یَعْلَمُ کو فعل نفی مان کر ترجمہ کیا جائے۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔

ترجمہ

وَلِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا	بِرَبِّهِمْ	عَذَابُ جَهَنَّمَ ؕ	وَبِئْسَ	الْمَصِيْرُ ⑥
اوران کے لیے جنہوں نے انکار کیا	اپنے رب کا	جہنم کا عذاب ہے	اور بہت بری ہے (وہ)	لوٹنے کی جگہ

اِذَآ اُلْقُوْا فِيْهَا	سَمِعُوْا لَهَا	شَهِيْقًا	وَّهِيَ تَفُوْرُ ۙ⑦	تَكَادُ تَمَيَّزُ
جب وہ ڈالے جائیں گے اس میں	تو وہ سنیں گے اس میں	رینکنے والی آواز	اس حال میں کہ وہ ابلتی ہوگی	قریب ہے کہ وہ پھٹ پڑے گی

مِنَ الْغَيْظِ ؕ	كُلَّمَآ	اُلْقِيَ فِيْهَا فَوْجٌ	سَاَلَهُمْ	خَزَنَتُهَآ	اَلَمْ يَاْتِكُمْ
شدید غصہ سے	جب کبھی بھی	ڈالا جائے گا اس میں کسی گروہ کو	تو پوچھیں گے ان سے	اس (جہنم) کے داروغہ لوگ	کیا نہیں پہنچا تمہارے پاس

نَذِيْرٌ ⑧	قَالُوْا بَلٰى	قَدْ جَآءَنَا	نَذِيْرٌ ۙ	فَكَذَّبْنَا وَقُلْنَا
کوئی خبردار کرنے والا	وہ لوگ کہیں گے کیوں نہیں	آچکا تھا ہمارے پاس	ایک خبردار کرنے والا	تو ہم نے جھٹلایا اور ہم نے کہا

مَا نَزَّلَ اللّٰهُ	مِنْ شَيْءٍ ۚ	اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا	فِيْ ضَلٰلٍ كَبِيْرٍ ⑨
نہیں اتاری اللہ نے	کوئی بھی چیز	نہیں ہو تم (خبردار کرنے والے) لوگ مگر	ایک بڑی گمراہی میں

وَقَالُوْا	لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ	اَوْ نَعْقِلُ	مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑩
اور وہ (جہنمی) لوگ کہیں گے	کاش ہم سنا کرتے	یا عقل استعمال کیا کرتے	تو ہم نہ ہوتے آگ والوں میں

فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ	فَسُحْقًا	لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ⑪	اِنَّ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ
پھر وہ لوگ اعتراف کریں گے اپنے گناہ کا	(تو ثابت ہوگی) دوری (رحمت سے)	آگ والوں کے لیے	بیشک جو لوگ مرعوب رہتے ہیں اپنے رب سے

بِالْغَيْبِ	لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ	وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ ⑫	وَاَسِرُّوْا قَوْلَكُمْ	اَوِ اجْهَرُوْا بِهٖ ؕ	اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ
اَن دیکھے میں	ان کے لیے مغفرت ہے	اور بڑا اجر ہے	اور تم لوگ چھپاؤ اپنی بات کو	یا نمایاں کرو اس کو	بیشک وہ (تو) جاننے والا ہے

بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۳﴾	اَ	لَا يَعْلَمُ	مَنْ خَلَقَ ؕ	وَهُوَ اللَّطِيْفُ	الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾ ع
سینوں والی (بات) کو (بھی)	کیا	نہیں جانے گا	وہ جس نے پیدا کیا	درآنحالیکہ وہی باریک بین ہے	باخبر ہے

6892

نوٹ: 1

آیت۔7 میں شَهِيْقٌ کا لفظ استعمال ہوا ہے جو گدھے کی سی آواز کے لیے بولا جاتا ہے۔اس فقرے کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ خود جہنم کی آواز ہوگی، اور یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ آواز جہنم سے آرہی ہوگی جہاں ان سے پہلے گرے ہوتے لوگ چیخیں مار رہے ہوں گے۔اس دوسرے مفہوم کی تائید سورۃ ہودؑ کی آیت۔106 سے ہوتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ دوزخ میں یہ دوزخی لوگ ہانپیں گے اور پھنکاریں گے اور پہلے مفہوم کی تائید سورۂ فرقان کی آیت۔12 سے ہوتی ہے جس میں ارشاد ہوا ہے کہ دوزخ میں جاتے ہوئے یہ لوگ دور ہی سے اس کے غضب اور جوش کی آوازیں سنیں گے۔اس بنا پر صحیح یہ ہے کہ شور خود جہنم کا بھی ہوگا اور جہنمیوں کا بھی۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (15 تا 22)

ترکیب

(آیت۔15) رِزْقِهٖ کی ضمیر هُوَ الَّذِیْ کے لیے ہے۔اگر اَلْاَرْضَ کے لیے ہوتی تو رِزْقَهَا آتا۔(آیت۔17۔18) نَذِيْرِ اور نَكِيْرِ کی ر پر کسرہ بتا رہی ہے کہ ان کے آگے یائے متکلم محذوف ہیں اور یہ دراصل نَذِيْرِیْ اور نَكِيْرِیْ ہیں (آیت۔20) اَمَّنْ دراصل اَمْ مَنْ ہے جس کو ملا کر لکھا گیا ہے۔(آیت۔21) اَمْسَكَ میں شامل هُوَ کی ضمیر کو اگر قریبی مرجع هٰذَا الَّذِیْ کے لیے مانیں تو جملہ بے معنی ہو جاتا ہے۔اس سے معلوم ہوا کہ یہ ضمیر اَلرَّحْمٰن کے لیے ہے۔(آیت۔22) يَمْشِیْ فعل لازم ہے۔اس لیے مُكِبًّا اور سَوِيًّا اس کے مفعول نہیں ہو سکتے بلکہ یہ حال ہیں۔

ترجمہ

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ	ذَلُوْلًا	فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا
وہ، وہ ہے جس نے بنایا تمہارے لیے زمین کو	رام (تابعدار) کی ہوئی	پس تم لوگ چلو اس کے کندھوں (راستوں) میں

وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ ؕ	وَاِلَيْهِ النُّشُوْرُ ﴿۱۵﴾	ءَاَمِنْتُمْ	مَّنْ فِی السَّمَآءِ
اور کھاؤ اس (اللہ) کے رزق میں سے	اور اس ہی کی طرف دوبارہ اٹھنا ہے	کیا تم لوگ امن میں (نڈر) ہو گئے	اُس سے جو آسمان میں ہے

اَنْ يَّخْسِفَ	بِكُمُ الْاَرْضَ	فَاِذَا هِیَ تَمُوْرُ ﴿۱۶﴾	اَمْ اَمِنْتُمْ
(اس سے) کہ وہ دھنسا دے	تمہارے ساتھ زمین کو	پھر جب ہی وہ کپکپاتی ہو	یا تم لوگ امن میں ہو گئے

مَّنْ فِی السَّمَآءِ	اَنْ يُّرْسِلَ عَلَيْكُمْ	حَاصِبًا ؕ	فَسَتَعْلَمُوْنَ كَيْفَ	نَذِيْرِ ﴿۱۷﴾
اُس سے جو آسمان میں ہے	کہ وہ بھیج دے تم لوگوں پر	کنکریاں مارنے والی تند ہوا	پھر تم جان لوگے (کہ) کیسا تھا	میرا خبردار کرنے والا

وَلَقَدْ كَذَّبَ	الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ	فَكَيْفَ كَانَ	نَكِيْرِ ﴿۱۸﴾
اور بیشک جھٹلا چکے ہیں	وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے	تو (دیکھو کہ) کیسا تھا	میرا عدم عرفان

اَوَلَمْ يَرَوْا	اِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ	صٰٓفّٰتٍ	وَّيَقْبِضْنَ ۛ	مَا يُمْسِكُهُنَّ
اور کیا انہوں نے غور ہی نہیں کیا	پرندوں کی طرف اپنے اوپر	صف بچھانے (پھیلانے) والے ہوتے ہوئے	اور سمیٹتے ہوئے	نہیں تھامتا ان کو (کوئی)

اِلَّا الرَّحۡمٰنُ ؕ	اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیۡءٍۭ	بَصِیۡرٌ ﴿۱۹﴾	اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ	هُوَ جُنۡدٌ لَّكُمۡ
سوائے رحمٰن کے	بیشک وہ ہر چیز کو	دیکھنے والا ہے	یا کون یہ ہے جو (کہ)	وہ ہو ایسا لشکر تمہارے لیے

یَنۡصُرُكُمۡ	مِّنۡ دُوۡنِ الرَّحۡمٰنِ ؕ	اِنِ الۡكٰفِرُوۡنَ	اِلَّا فِیۡ غُرُوۡرٍ ﴿۲۰﴾
جو مدد کرے تمہاری	رحمٰن کے بجائے	نہیں ہیں کافر لوگ	مگر کچھ فریبوں میں (مبتلا)

اَمَّنۡ هٰذَا الَّذِیۡ	یَرۡزُقُكُمۡ	اِنۡ اَمۡسَكَ رِزۡقَهٗ ۚ	بَلۡ لَّجُّوۡا	فِیۡ عُتُوٍّ
یا کون یہ ہے جو	روزی دے تم کو	اگر وہ (رحمٰن) روک لے اپنا رزق	بلکہ وہ لوگ اڑے رہے	سرکشی کرنے میں

وَّنُفُوۡرٍ ﴿۲۱﴾	اَفَمَنۡ یَّمۡشِیۡ	مُكِبًّا	عَلٰی وَجۡهِهٖۤ
اور بیزاریوں میں	تو کیا وہ جو چلتا ہے	اوندھا کرنے والا ہوتے ہوئے (خود کو)	اپنے چہرے کے بل

اَهۡدٰۤی	اَمَّنۡ یَّمۡشِیۡ	سَوِیًّا	عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۲﴾
زیادہ ہدایت پر ہے	یا وہ چلتا ہے	کامل (سیدھا) ہوتے ہوئے	ایک سیدھے راستے پر

نوٹ:1

فرمایا کہ زمین کو تمہارے لیے ہم نے ایسا مطیع بنا دیا کہ تم اس کے مونڈھوں (کندھوں) پر چڑھتے پھرو۔ مطلب یہ ہے کہ زمین کو حق تعالیٰ نے ایک ایسا قوام (مادہ) بخشا ہے کہ نہ تو پانی کی طرح بہنے والا ہے، نہ روئی اور کیچڑ کی طرح دبنے والا، کیونکہ زمین ایسی ہوتی تو اس پر کسی انسان کا ٹھہرنا ناممکن ہوتا۔ اسی طرح زمین کو لوہے یا پتھر کی طرح سخت بھی نہیں بنایا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس میں درخت اور کھیتی نہ بوئی جا سکتی، کنویں اور نہریں نہ کھودی جا سکتیں اور اس کو کھود کر اونچی عمارتوں کی بنیاد نہ رکھی جا سکتی۔ اس قوام (نرم مادے) کے ساتھ اس کو ایسا سکون بخشا کہ اس پر عمارتیں ٹھہر سکیں اور چلنے پھرنے والوں کو لغزش نہ ہو۔ (معارف القرآن)

نوٹ:2

مَنۡ فِی السَّمَآءِ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمان میں رہتا ہے بلکہ یہ بات اس لحاظ سے فرمائی گئی ہے کہ انسان فطری طور پر جب خدا سے رجوع کرنا چاہتا ہے تو آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ دعا مانگتا ہے تو آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی کتابوں کو کتب سماوی کہا جاتا ہے۔ اس طرح کی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بات کچھ انسان کی فطرت ہی میں ہے کہ وہ جب خدا کا تصور کرتا ہے تو اس کا ذہن آسمان کی طرف جاتا ہے۔ اسی بات کو ملحوظ رکھ کے اللہ تعالیٰ کے متعلق یہاں مَنۡ فِی السَّمَآءِ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس میں اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کو آسمان میں مقیم قرار دیتا ہے۔ یہ شبہ آخر کیسے پیدا ہو سکتا ہے جب کہ اسی سورۂ ملک کے آغاز میں فرمایا جا چکا ہے کہ جس نے تہہ بہ تہہ سات آسمان پیدا کیے اور سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا ہے فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡهُ اللّٰهِ (پس تم جدھر بھی رخ کرو اُس طرف اللہ کا رخ ہے) (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

آیت۔22۔ میں اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ ان لوگوں پر ہدایت کی راہ کیوں نہیں کھل رہی ہے اور سمجھانے کے باوجود یہ گمراہی میں بھٹک رہے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ اپنی خواہشوں کے غلام ہیں۔ جس طرح کتا زمین کو سونگتا ہوا چلتا ہے کہ شائد کوئی چیز کھانے کی مل جائے۔ اسی طرح ان لوگوں کی رہنما بھی عقل کے بجائے ان کی خواہش ہے اور یہ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے اپنی خواہش کے پیچھے چل رہے ہیں۔ خواہش کے پیچھے چلنے والا کبھی ہدایت کی راہ نہیں پا سکتا۔ ہدایت کی راہ اس کو ملتی ہے جو سیدھی راہ پر سر اٹھا کر دہنے بائیں اور آگے پیچھے کا جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی لیے انسان کو مستوی القامت پیدا کیا، جانوروں کی طرح زمین کی طرف جھکا ہوا نہیں پیدا کیا۔ لیکن بہت سے انسان جانوروں ہی کی روش کی تقلید کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اس اعلیٰ خصوصیت کو کھو بیٹھتے ہیں جو انسان کا اصلی شرف ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ

1892

رہے کہ خواہش کے پیچھے چلنے والوں کی مثال قرآن میں جگہ جگہ جانوروں سے دی گئی ہے۔(تدبر قرآن)

آیت نمبر (23تا30)

ترجمہ

قُلْ	هُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَكُمْ	وَجَعَلَ لَكُمُ	السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ
آپ ؐ کہیے	وہ، وہ ہے جس نے اٹھایا تم لوگوں کو	اور بنائے تمہارے لیے	سماعت اور بصارتیں اور دل

قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ﴿۲۳﴾	قُلْ هُوَ الَّذِيْ	ذَرَاَكُمْ فِي الْاَرْضِ	وَاِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۲۴﴾
بہت تھوڑا تم لوگ شکر کرتے ہو	آپ ؐ کہیے وہ، وہ ہے جس نے	بکھیرا تم لوگوں کو زمین میں	اور اس کی طرف ہی تم لوگ اکٹھا کیے جاؤ گے

وَيَقُوْلُوْنَ	مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ	اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾	قُلْ اِنَّمَا الْعِلْمُ
اور یہ لوگ کہتے ہیں	کب ہے یہ وعدہ	اگر تم لوگ سچے ہو	آپ ؐ کہیے اور علم تو بس

عِنْدَ اللّٰهِ ۠	وَاِنَّمَآ اَنَا	نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲۶﴾
اللہ کے پاس ہے	اور میں تو صرف	ایک کھلا کھلا خبردار کرنے والا ہوں

فَلَمَّا رَاَوْهُ	زُلْفَةً	سِيْٓـَٔتْ
پھر جب وہ دیکھیں گے اُس (وعدہ) کو	قریب میں	تو بگاڑے جائیں گے

وُجُوْهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	وَقِيْلَ هٰذَا الَّذِيْ	كُنْتُمْ بِهٖ تَدَّعُوْنَ ﴿۲۷﴾	قُلْ اَرَءَيْتُمْ
ان لوگوں کے چہرے جنہوں نے کفر کیا	اور کہا جائے گا یہ ہے وہ	تم لوگ جس کو مانگا کرتے تھے	آپ ؐ کہیے کیا تم لوگوں نے غور کیا

اِنْ اَهْلَكَنِيَ اللّٰهُ	وَمَنْ مَّعِيَ	اَوْ رَحِمَنَا ۙ	فَمَنْ يُّجِيْرُ الْكٰفِرِيْنَ
اگر ہلاک کردے مجھ کو اللہ	اور ان کو (بھی) جو میرے ساتھ ہیں	یا رحم کرے ہم پر	تو کون بچائے گا کافروں کو

مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۸﴾	قُلْ هُوَ الرَّحْمٰنُ	اٰمَنَّا بِهٖ	وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا ۚ
ایک دردناک عذاب سے	آپ ؐ کہیے وہی رحمٰن ہے	ہم ایمان لائے جس پر	اور اس پر ہی ہم نے بھروسہ کیا

فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ	فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۹﴾	قُلْ اَرَءَيْتُمْ
پس تم لوگ جان لوگے کون وہ ہے جو	ایک کھلی گمراہی میں ہے	آپ ؐ کہیے کیا تم لوگوں نے غور کیا

اِنْ اَصْبَحَ مَآؤُكُمْ	غَوْرًا	فَمَنْ يَّاْتِيْكُمْ	بِمَآءٍ مَّعِيْنٍ ﴿۳۰﴾ ع
اگر ہو جائے تمہارا پانی	زمین میں جذب	تو کون لائے گا تمہارے پاس	کچھ رواں پانی

نوٹ:1

آیت۔23۔میں اعضاءانسانی میں اُن تین اعضاء کا ذکر ہے جن پر علم وادراک اور شعور موقوف ہے۔فلاسفہ نے علم وادراک کے پانچ ذریعے بیان کیے ہیں جن کو حواس خمسہ کہا جاتا ہے۔ان پانچ چیزوں میں سے صرف دو کا ذکر کیا ہے یعنی کان اور آنکھ۔وجہ یہ ہے کہ سونگھنے، چکھنے اور چھونے سے بہت کم چیزوں کا علم انسان کو حاصل ہوتا ہے۔اس کی معلومات کا بڑا مدار سننے اور دیکھنے پر ہے۔اوران میں بھی سننے کو مقدم کیا گیا ہے۔غور کرو تو معلوم ہوگا کہ انسان کو اپنی عمر میں جتنی معلومات ہوتی ہیں ان میں سنی ہوئی چیزیں بہ نسبت دیکھی ہوئی چیزوں کے بدرجہا زائد ہوتی ہیں۔بیشتر معلومات انسانی انہیں دوراہوں سے حاصل ہوتی ہیں اور تیسری چیز قلب پر موقوف ہے۔جبکہ فلاسفہ (یعنی فلسفی لوگ) دماغ کو اس کا مرکز مانتے ہیں۔(معارف القرآن)۔

حواس خمسہ سے حاصل شدہ معلومات کے ضمن میں دماغ یعنی عقل اور دل، دونوں کا اپنا اپنا ایک رول ہے جس کی وضاحت آیت۔7/179،نوٹ۔2میں کی جاچکی ہے۔اسے دوبارہ دیکھ لیں۔(مرتب)

نوٹ:2

آیت۔24۔میں اس حقیقت کی یاددہانی کردی ہے کہ ایک کسان اپنے کھیت میں کوئی فصل بوتا ہے،اس کو کھاد اور پانی دیتا ہے، چرندو پرند سے اس کی حفاظت کرتا ہے تو ہر دیکھنے والا بن بتائے یہ جانتا ہے کہ ایک دن وہ اس کو کاٹے گا اور اس کے دانے اور بھس کو الگ الگ کرے گا۔آخر یہ واضح حقیقت خدا کے متعلق تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔اگر تم عقل سے کام لو (آیت۔23 کے حوالے سے) تو یہ واضح حقیقت نہایت آسانی سے سمجھ میں آجانی چاہیے کہ جس خدا نے تم کو زمین میں بو یا (پھیلایا) ہے اور تمہاری پرورش کررہا ہے وہ تم کو یونہی نہیں چھوڑ رکھے گا، بلکہ وہ اپنی بوئی ہوئی فصل کاٹ کر اپنے کھلیان میں جمع کرے گا۔پھر اس کے دانے کو بھس سے الگ کرے گا اور اس کو کھتے میں جمع کر کے بھس کو جلادے گا۔یہ امر واضح رہے کہ قرآن نے یہاں جو حقیقت نہایت سادہ لفظوں میں بیان کردی ہے، قدیم صحیفوں خصوصاً انجیل میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔(تدبر قرآن)

نوٹ:3

آخر سورۃ میں (آیت۔30) پھر ایک جملہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ زمین پر بسنے والو اور اس کو کھود کر کنویں بنانے والو اور اس کے پانی سے اپنے پینے پلانے اور نباتات اگانے کا کام لینے والو، اس بات کو مت بھولو کہ یہ سب چیزیں کوئی تمہاری ذاتی جاگیر نہیں ہیں، بلکہ صرف حق تعالیٰ کا عطیہ ہیں۔پانی اس نے برسایا، پانی کو برف کی شکل میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر اس نے لاد دیا، پھر برف کو آہستہ آہستہ پگھلا کر پہاڑوں کے عروق کے ذریعہ زمین کے اندر اس نے اتارا اور بغیر کسی پائپ لائن کے پوری زمین میں اس کا ایسا جال پھیلا دیا کہ جہاں چاہو زمین کھود کر پانی نکال لو۔مگر یہ پانی اس نے زمین کی اوپری سطح پر رکھا ہے جس کو چند فٹ یا چند گز زمین کھود کر نکالا جاسکتا ہے۔یہ مالک وخالق کا عطیہ ہے اگر وہ چاہے تو اس پانی کو زمین کی نیچے کی سطح پر اتار دے جہاں تک تمہاری رسائی ممکن نہ ہو۔تو تمہاری کون سی طاقت ہے جو اس جاری پانی کو حاصل کر سکے۔حدیث میں ہے کہ جب آدمی اس آیت کی تلاوت کرے تو اس کو کہنا چاہیے اَللّٰہُ رَبُّ الْعٰلَمِیْن۔یعنی اللہ ہی پھر اس کو لاسکتا ہے، ہماری کسی کی طاقت نہیں۔(معارف القرآن)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6892

سورۃ القلم (68)

آیت نمبر (1 تا 16)

ترجمہ

نٓ	وَالۡقَلَمِ	وَمَا یَسۡطُرُوۡنَ ۙ﴿۱﴾	مَاۤ اَنۡتَ بِنِعۡمَۃِ رَبِّکَ	بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲﴾
۔	قسم ہے قلم کی	اور اس کی جو وہ لکھتے ہیں	نہیں ہیں آپؐ اپنے رب کی نعمت کے سبب سے	کوئی مجنون

وَاِنَّ لَکَ	لَاَجۡرًا	غَیۡرَ مَمۡنُوۡنٍ ۚ﴿۳﴾	وَاِنَّکَ	لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ﴿۴﴾
اور بیشک آپؐ کے لیے	یقیناً ایک ایسا اجر ہے جو	منقطع ہونے والا نہیں ہے	اور بیشک آپؐ	یقیناً عظیم اخلاقیات پر ہیں

فَسَتُبۡصِرُ	وَیُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۵﴾	بِاَیِّیۡکُمُ	الۡمَفۡتُوۡنُ ﴿۶﴾	اِنَّ رَبَّکَ ہُوَ اَعۡلَمُ
پس آپؐ دیکھیں گے	اور یہ لوگ (بھی) دیکھ لیں گے	تمہارے کس کے ساتھ	مبتلاءِ فتنہ (شخص) ہے	بیشک آپؐ کا رب ہی خوب جاننے والا ہے

بِمَنۡ ضَلَّ	عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ۪	وَہُوَ اَعۡلَمُ بِالۡمُہۡتَدِیۡنَ ﴿۷﴾	فَلَا تُطِعِ الۡمُکَذِّبِیۡنَ ﴿۸﴾
اس کو جو بھٹک گیا	اس کے راستے سے	اور وہ ہی خوب جاننے والا ہے ہدایت پانے والوں کو	تو آپؐ کہنا مت مانیں جھٹلانے والوں کا

وَدُّوۡا	لَوۡ تُدۡہِنُ	فَیُدۡہِنُوۡنَ ﴿۹﴾	وَلَا تُطِعۡ	کُلَّ حَلَّافٍ
ان لوگوں نے خواہش کی	کاش آپؐ ڈھیلے پڑیں	تو وہ لوگ بھی ڈھیلے پڑیں گے	تو آپؐ کہنا مت مانیں	کسی بھی بہت قسم کھانے والے کا

مَّہِیۡنٍ ۙ﴿۱۰﴾	ہَمَّازٍ	مَّشَّآءٍۭ	بِنَمِیۡمٍ ۙ﴿۱۱﴾	مَّنَّاعٍ لِّلۡخَیۡرِ
کسی بے وقعت کا	کسی کثرت سے طعنہ دینے والے کا	بہت چننے والا	چغلی کے ساتھ	بہت منع کرنے والا کسی بھی بھلائی سے

مُعۡتَدٍ	اَثِیۡمٍ ۙ﴿۱۲﴾	عُتُلٍّۭ	بَعۡدَ ذٰلِکَ	زَنِیۡمٍ ۙ﴿۱۳﴾	اَنۡ کَانَ
زیادتی کرنے والا	پکا گنہگار	بدمزاج	اس کے بعد (ساتھ)	بدذات بھی	(اس لیے) کہ وہ ہوا

ذَا مَالٍ وَّ بَنِیۡنَ ؕ﴿۱۴﴾	اِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِ	اٰیٰتُنَا	قَالَ
مال اور بیٹوں والا	جب بھی پڑھ کر سنائی جاتی ہیں اس کو	ہماری آیتیں	تو وہ کہتا ہے

اَسَاطِیۡرُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۱۵﴾	سَنَسِمُہٗ	عَلَی الۡخُرۡطُوۡمِ ﴿۱۶﴾
پہلے لوگوں کی داستانیں ہیں	ہم داغ دیں گے اس کو	سونڈ (ناک) پر

نوٹ: 1

رسول کریمؐ کے وجود میں حق تعالیٰ نے تمام ہی اخلاق فاضلہ بدرجہ کمال جمع فرما دیئے تھے۔ خود آنحضرتؐ نے فرمایا کہ مجھے اس کام کے لیے بھیجا گیا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کروں۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے دس سال رسول اللہؐ کی خدمت کی اس پوری مدت میں جو کام میں نے کیا، آپؐ نے کبھی یہ نہیں فرمایا کہ ایسا کیوں کیا اور جو کام نہیں کیا اس پر کبھی یہ نہیں فرمایا کہ یہ کام کیوں نہیں کیا۔ بی بی عائشہؓ فرماتی ہیں کہ

رسول اللہؐ نے کبھی اپنے ہاتھ سے کسی کو نہیں مارا بجز جہاد فی سبیل اللہ کے۔ آپؐ نے نہ کسی خادم کو، نہ کسی عورت کو کبھی مارا۔ ان میں سے کسی سے خطا ولغزش بھی ہوئی تو اس کا انتقام نہیں لیا بجز اس کے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہو تو شرعی سزا جاری فرمائی۔ آپؐ نہ فحش گو تھے نہ فحش کے پاس جاتے تھے، نہ بازار میں شور وشغب کرتے تھے۔ برائی کا بدلہ کبھی برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معافی اور درگزر کا معاملہ فرماتے تھے۔ اور حضرت ابو درداءؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ میزانِ عمل میں خلق حسن کے برابر کسی عمل کا وزن نہیں ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ گالی گلوچ کرنے والے بدزبان سے بغض رکھتے ہیں۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مسلمان اپنے حسن خلق کی بدولت اس شخص کا درجہ حاصل کر لیتا ہے جو ہمیشہ رات کو عبادت میں جاگتا اور دن بھر روزہ رکھتا ہو۔ اور حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ مجھے یمن کا عامل۔ (گورنر) مقرر کر کے بھیجنے کے وقت آخری وصیت جو آپؐ نے مجھے اس وقت فرمائی جبکہ میں اپنا ایک پاؤں رکاب میں رکھ چکا تھا، وہ یہ تھی کہ اے معاذؓ لوگوں سے حسن خلق کا برتاؤ کرنا۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 1 آیت۔ 10۔ کو سابقہ آیت فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ پر عطف کر کے تاکید کے ساتھ پھر تنبیہ فرمائی کہ تم ہر لپاٹیے ذلیل کی باتوں پر کان نہ دھرو۔ یہ اشارہ کسی خاص شخص کی طرف نہیں ہے بلکہ قریش کی پوری قیادت کی اخلاقی پستی کی تصویر آگے کی چند آیتوں میں کھینچ دی گئی ہے اور مقصود یہ دکھانا ہے کہ ایک طرف پیغمبر کا بے مثال خلقِ عظیم ہے اور دوسری طرف قریش کے لیڈروں کا یہ کردار ہے جو بینا ہو رہا ہے۔ ان دونوں کے سامنے رکھ کر ہر منصف مزاج فیصلہ کر سکتا ہے کہ کون کس انجام سے دوچار ہونے والا ہے۔

یہ بات کہ یہاں کسی خاص شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا کردار بیان ہو رہا ہے، مختلف پہلوؤں سے واضح ہے۔ (۱) اس کا عطف اَلْمُكَذِّبِيْنَ پر ہے اور مُكَذِّبِيْنَ سے مراد ظاہر ہے کہ کوئی متعین شخص نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت ہے۔ (۲) لفظ كُلَّ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں کسی متعین شخص کا کردار زیر بحث نہیں ہے بلکہ جماعت کا کردار ہے۔ (۳) یہاں جو کردار بیان ہوا ہے وہ قریش کی پوری قیادت پر تو ٹھیک ٹھیک منطبق ہو جاتا ہے لیکن ہر بات اگر کسی ایک شخص پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے تو تکلف کرنا پڑے گا۔ (تدبر قرآن)

آیت نمبر (17 تا 33)

ص ر م

(ض) صَرْمًا (۱) کسی چیز کا ٹوٹنا (لازماً) کسی چیز کو کاٹنا (متعدی)۔ زیر مطالعہ آیت۔ 17۔

صَارِمٌ اسم الفاعل ہے۔ کاٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 22۔

صَرِيْمٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے اسم المفعول کے معنی میں۔ کاٹا ہوا۔ پھر اس فصل کے لیے بھی آتا ہے جو کاٹ لی گئی ہو اور اس زمین کے لیے بھی جس کی فصل کاٹ لی گئی ہو۔ زیر مطالعہ آیت۔ 20۔

ح ر د

(ض) حَرْدًا (۱) منع کرنا۔ (۲) ارادہ کرنا۔

حَرْدٌ اسم ذات بھی ہے۔ ارادہ۔ زیر مطالعہ آیت۔ 25۔

ترکیب (آیت۔17) بَلَوْنٰهُمْ میں هُمْ کی ضمیر اہل مکہ کے لیے ہے۔ اَقْسَمُوْا میں شامل هُمْ کی ضمیر فاعلی اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ کے لیے ہے۔ (آیت۔24) یہاں پر لَا يَدْخُلَنَّ کے دو امکانات ہیں۔ ایک یہ کہ اس کو مضارع منفی مانا جائے جس پر نون ثقیلہ داخل ہوا ہے۔ ایسی صورت میں ترجمہ ہوگا ''ہرگز داخل نہیں ہوگا۔'' دوسرا یہ کہ اس کو لائے نہی غائب لَا يَدْخُلْ مانا جائے جس پر نون ثقیلہ داخل ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ ہوگا ''چاہے کہ ہرگز داخل نہ ہو۔'' سیاق وسباق کے لحاظ سے دوسرے امکان کو ترجیح دینا بہتر ہے۔

ترجمہ

اِنَّا بَلَوْنٰهُمْ	كَمَا بَلَوْنَآ	اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ	اِذْ اَقْسَمُوْا
بیشک ہم نے آزمائش میں ڈالا ان کو	جیسے ہم نے آزمایا	باغ والوں کو	جب انہوں نے قسم کھائی

لَيَصْرِمُنَّهَا	مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۱۷﴾	وَلَا يَسْتَثْنُوْنَ ﴿۱۸﴾	فَطَافَ عَلَيْهَا
ہم لازماً کاٹیں گے اس (باغ کی فصل) کو	صبح کرنے والے ہوتے ہوئے	اور انہوں نے استثناء (ان شاء اللہ) نہیں کہا	تو گھوم گیا اس (باغ) پر

طَآئِفٌ	مِّنْ رَّبِّكَ	وَ	هُمْ نَآئِمُوْنَ ﴿۱۹﴾	فَاَصْبَحَتْ	كَالصَّرِيْمِ ۙ﴿۲۰﴾
ایک گھومنے والا (بگولہ)	آپؐ کے رب (کی طرف) سے	اس حال میں کہ	وہ لوگ نیند کرنے والے تھے	نتیجۃً وہ (باغ) صبح کو ہوگیا	کاٹے ہوئے کھیت کی مانند

فَتَنَادَوْا	مُصْبِحِيْنَ ۙ﴿۲۱﴾	اَنِ اغْدُوْا	عَلٰى حَرْثِكُمْ	اِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِيْنَ ﴿۲۲﴾
تو انہوں نے ایک دوسرے کو پکارا	صبح سویرے	کہ تم لوگ سویرے پہنچو	اپنی کھیتی پر	اگر تم لوگ ہو کاٹنے والے

فَانْطَلَقُوْا	وَهُمْ يَتَخَافَتُوْنَ ۙ﴿۲۳﴾	اَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا	الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ
تو وہ لوگ چلے	اور وہ لوگ باہم سرگوشی کرتے تھے	کہ چاہیے کہ ہرگز داخل نہ ہو اس (باغ) میں	آج تم پر

مِّسْكِيْنٌ ۙ﴿۲۴﴾	وَّغَدَوْا	عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِيْنَ ﴿۲۵﴾	فَلَمَّا رَاَوْهَا	قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ﴿۲۶﴾
کوئی مسکین	اور وہ سویرے نکلے	ایک ارادہ پر قادر ہوتے ہوئے	پھر جب انہوں نے دیکھا اس (باغ) کو	تو کہا بیشک ہم یقیناً راستہ بھولنے والے ہیں

بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ ﴿۲۷﴾	قَالَ اَوْسَطُهُمْ	اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ	لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ ﴿۲۸﴾
(نہیں) بلکہ ہم محروم کیے گئے ہیں	کہا ان کے زیادہ افضل نے	کیا میں نے نہیں کہا تھا تم لوگوں سے	کہ تسبیح کیوں نہیں کرتے (اللہ کی)

قَالُوْا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ	اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۲۹﴾	فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ	يَّتَلَاوَمُوْنَ ﴿۳۰﴾
انہوں نے کہا ہمارے رب کی پاکیزگی ہے	بیشک ہم تھے ظلم کرنے والے	تو سامنے ہوا ان کا کوئی کسی پر	باہم ملامت کرتے ہوئے

قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ	اِنَّا كُنَّا طٰغِيْنَ ﴿۳۱﴾	عَسٰى رَبُّنَآ	اَنْ يُّبْدِلَنَا
انہوں نے کہا ہائے ہماری بربادی	ہم تھے حد سے بڑھنے والے	امید ہے ہمارے رب سے	کہ وہ بدلے میں دے ہم کو

خَيْرًا مِّنْهَآ	اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا	رٰغِبُوْنَ ﴿۳۲﴾	كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ
زیادہ بھلا اس (باغ) سے	بیشک ہم اپنے رب کی طرف	رغبت کرنے والے ہیں	ایسا ہوتا ہے (دنیوی) عذاب

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ	اَكْبَرُ ۘ	لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۳۳﴾
اور یقیناً آخرت کا عذاب (تو)	سب سے بڑا ہے	کاش یہ لوگ جانتے ہوتے

نوٹ:1

بَلَوْنٰهُمْ میں ضمیر هُمْ کا مرجع ظاہر ہے کہ وہی لوگ ہوں گے جن کا کردار اوپر زیر بحث آیا ہے۔ یہ اس بات کا واضح قرینہ ہے کہ وہ کردار کسی معین شخص کا نہیں بلکہ قریش کی پوری قیادت کا ہے، ورنہ جمع کی جگہ واحد ضمیر آتی۔ اسی طرح یہاں زبان کا ایک دوسرا نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ یہاں لفظ اَلْجَنَّةِ پر الف لام داخل ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ یہ کسی خاص باغ والوں کی طرف اشارہ ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ تمثیلات میں لام تعریف یا اَلَّذِیْ اور اَلَّتِیْ وغیر جو آتے ہیں تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ کوئی معین ذات مدنظر ہے بلکہ اس سے مقصود صرف صورتِ حال کو مُشَخَّص و مَصَوَّر کرنا ہوتا ہے تاکہ قاری کے سامنے واقعہ کی پوری تفصیل آجائے۔ اس وجہ سے یہاں کسی خاص باغ کے مالکوں کی جستجو کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک خاکہ ہے جس میں قریش کے لیڈروں کے ذہن اور ان کے انجام کی تصویر اس طرح کھینچ دی گئی ہے کہ اس کا کوئی گوشہ مخفی نہیں رہ گیا ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

لَا يَسْتَثْنُوْنَ کے معنی استثناء نہ کرنے کے ہیں اور مراد اس استثناء سے ان شاء اللہ کہنا ہے۔ اور بعض حضرات مفسرین نے استثناء سے مراد یہ لیا ہے کہ ہم پورا پورا غلہ اور پھل لے آئیں گے اور فقراء کا حصہ مستثنیٰ نہیں کریں گے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (34 تا 43)

ترکیب

قاعدہ یہ ہے کہ جملہ کے شروع میں اِنَّ (بیشک) آتا ہے۔ اور جملہ کے درمیان میں اَنَّ (کہ) آتا ہے۔ اس قاعدے کا ایک استثناء ہم آیت۔2/البقرۃ:25، نوٹ۔2۔ میں پڑھ چکے ہیں کہ قَالَ یا اس کے مشتقات سے شروع ہونے والے جملوں کے درمیان میں اِنَّ آتا ہے لیکن ایسی صورت میں اس کے معنیٰ ''کہ'' ہوتے ہیں۔ اس قاعدے کا دوسرا استثناء یہ ہے کہ اَنَّ کی خبر پر اگر لام تاکید آرہا ہو تو اس کی جگہ اِنَّ آتا ہے لیکن اس کے معنی اَنَّ (کہ) کے ہی ہوتے ہیں۔ اس حوالہ سے نوٹ کریں کہ آیت۔38۔39 میں لَمَا میں مَا پر لام تاکید آیا ہے اس لیے ان سے پہلے اِنَّ آیا ہے لیکن ان کے معنیٰ ''کہ'' ہی ہیں۔ تَخَيَّرُوْنَ اگر باب تفعیل سے ہوتا تو تُخَيِّرُوْنَ آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ باب تفعل سے تَتَخَيَّرُوْنَ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔ (آیت۔43) اَبْصَارُهُمْ جمع مکسر ہے اس لیے خَاشِعَةً مؤنث کا صیغہ آیا ہے اور یہ حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ	جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۳۴﴾	اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ
بیشک متقی لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس	دائمی نعمتوں کے باغات ہیں	تو کیا ہم بنائیں گے فرمانبرداروں کو

كَالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۳۵﴾	مَا لَكُمْ	كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۶﴾	اَمْ لَكُمْ كِتٰبٌ
مجرموں کے جیسا	تمہیں کیا ہے	کیسا تم لوگ فیصلہ کرتے ہو	یا تمہارے لیے کوئی ایسی (آسمانی) کتاب ہے

فِيْهِ تَدْرُسُوْنَ ﴿۳۷﴾	اِنَّ لَكُمْ فِيْهِ	لَمَا	تَخَيَّرُوْنَ ﴿۳۸﴾
جس میں تم سبق پڑھتے ہو	کہ تمہارے لیے اس (کتاب) میں	ضرور وہ ہے جو	تم لوگ اپنے لیے پسند کرتے ہو

اَمۡ لَكُمۡ اَيۡمَانٌ عَلَيۡنَا	بَالِغَةٌ اِلٰى يَوۡمِ الۡقِيٰمَةِ ۙ	اِنَّ لَكُمۡ	لَمَا	تَحۡكُمُوۡنَ ﴿۳۹﴾
یا تمہارے لیے ہم پر ایسی قسمیں ہیں جو	پہنچنے والی ہیں قیامت کے دن تک	کہ تمہارے لیے	ضرور وہ ہوگا جو	تم لوگ آڈر دو گے

سَلۡهُمۡ اَيُّهُمۡ	بِذٰلِكَ زَعِيۡمٌ ۚ ﴿۴۰﴾	اَمۡ لَهُمۡ شُرَكَآءُ ۚ	فَلۡيَاۡتُوۡا بِشُرَكَآئِهِمۡ
آپؐ پوچھیں ان سے کہ ان کا کون	اس کی ضمانت دینے والا ہے	یا ان کے لیے کچھ شریک ہیں	تو چاہیے کہ وہ آئیں اپنے شریکوں کے ساتھ

اِنۡ كَانُوۡا صٰدِقِيۡنَ ﴿۴۱﴾	يَوۡمَ يُكۡشَفُ عَنۡ سَاقٍ	وَّيُدۡعَوۡنَ اِلَى السُّجُوۡدِ
اگر وہ لوگ سچے ہیں	جس دن پردہ اٹھایا جائے گا پنڈلی سے	اور ان کو بلایا جائے گا سجدہ کرنے کی طرف

فَلَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ۙ ﴿۴۲﴾	خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ	تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ
تو وہ استطاعت نہ رکھتے ہوں گے	جھکی پڑیں گی ان کی نظریں	چھا جائے گی ان پر ذلت

وَقَدۡ كَانُوۡا يُدۡعَوۡنَ	اِلَى السُّجُوۡدِ	وَهُمۡ سٰلِمُوۡنَ ﴿۴۳﴾
حالانکہ وہ بلائے گئے تھے	سجدہ کرنے کی طرف	اس حال میں کہ وہ صحیح سالم تھے

نوٹ: 1

ان آیات میں نیک بندوں کی جزاء کا ذکر ہے اور اس کے بعد مشرکین کے ایک اور باطل دعوے کا رَدّ ہے۔ کفار مکہ کہا کرتے تھے کہ اول تو قیامت آنے والی نہیں ہے اور دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب کا قصہ سب افسانہ ہے۔ اور اگر بالفرض ایسا ہو بھی گیا تو ہمیں وہاں بھی ایسی ہی نعمتیں ملیں گی جیسے دنیا میں ملی ہیں۔ اس کا جواب دیا گیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نیک بندوں اور مجرموں کو برابر کر دے گا۔ یہ کیسا عجیب وغریب فیصلہ ہے جس کی نہ کوئی سند نہ دلیل نہ کسی آسمانی کتاب سے اس کا ثبوت اور نہ ہی اللہ کی طرف سے کوئی وعدہ وعید کہ وہاں بھی تمہیں نعمت دے گا۔

ان آیات کے مذکورہ طرز استدلال سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کا آنا حساب کتاب کا ہونا اور نیک و بد کی جزاء وسزا، یہ سب عقلاً ضروری ہے (یعنی انسانی عقل اس کا تقاضہ کرتی ہے) دنیا میں ہر شخص اس کا مشاہدہ کرتا ہے اور کوئی اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ دنیا میں عموماً بدکار اور ظالم نفع میں رہتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ پھر وہ نہ خوف خدا کو جانیں، نہ آخرت کو مانیں، نہ کسی شرم وحیا کے پابند ہوں اور اپنے نفس کی خواہشات کو جس طرح چاہیں پورا کرتے ہیں جبکہ نیک آدمی اوّل تو خدا سے ڈرتا ہے اور اگر وہ نہ ہو تو برادری کی شرم وحیات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دنیا کے کارخانے میں تو بدکار اور بدمعاش کامیاب اور نیک شریف آدمی ناکام نظر آتا ہے۔ اب اگر آگے بھی کوئی ایسا وقت نہ آئے جس میں حق اور ناحق کا صحیح انصاف ہو، نیک کو اچھا بدلہ ملے اور بد کو سزا ملے تو پھر اوّل تو کسی برائی کو برائی کہنا لغو اور بے معنیٰ ہو جاتا ہے اور دوم یہ کہ پھر عدل وانصاف کے کوئی معنی باقی نہیں رہتے۔ جو لوگ خدا کے وجود کے قائل ہیں وہ اس کا کیا جواب دیں گے کہ خدا تعالیٰ کا انصاف کہاں گیا۔

رہا یہ خیال کہ دنیا میں مجرم پکڑا جاتا ہے اور سزا پاتا ہے۔ اس طرح شریف آدمی کا امتیاز اسی دنیا میں واضح ہو جاتا ہے اور عدل و انصاف حکومتوں کے قوانین سے قائم ہو جاتا ہے (تو پھر دوبارہ زندہ ہو کر حساب کتاب اور جزاء وسزا کی کیا ضرورت ہے۔ مرتب) یہ اس لیے غلط ہے کہ اوّل تو ہر جگہ اور ہر حال میں حکومت کی نگرانی ہو ہی نہیں سکتی، جہاں ہو جاوے وہاں عدالتی ثبوت ہر جگہ بہم پہنچانا آسان نہیں اور

جہاں ثبوت بھی بہم پہنچ جائے تو زور وزر اور رشوت وسفارش اور دباؤ کے کتنے چور دروازے ہیں جن سے مجرم نکل بھاگتا ہے۔ اس دنیا کی حکومتی اور عدالتی جرم وسزا کا جائزہ لیا جائے تو یہاں پر سزا صرف وہ بے عقل اور بے سہارا آدمی پاتا ہے جو کوئی چور دروازہ نہ نکال سکے۔ باقی سب مجرم آزاد پھرتے ہیں۔ قرآن مجید کے الفاظ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ عقلاً ایک ایسا وقت آنا ضروری ہے جب سب کا حساب ہو اور جہاں مجرموں کے لیے چور دروازہ نہ ہو۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔42۔ میں يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ کے الفاظ کے متعلق صحابۂ کرامؓ اور تابعین کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ الفاظ محاورے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ عربی محاورے کے مطابق سخت وقت آپڑنے کو کشفِ ساق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ایک اور قول کے مطابق اس میں کشفِ ساق سے مراد حقائق پر سے پردہ اٹھانا لیا گیا ہے۔ اس تاویل کی رو سے معنی یہ ہوں گے کہ جس روز تمام حقیقتیں بے نقاب ہو جائیں گی اور لوگوں کے اعمال کھل کر سامنے آجائیں گے اور قیامت کے دن اس بات کا مظاہرہ کرایا جائے گا کہ دنیا میں کون اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا تھا اور کون اس سے منحرف تھا۔ اس غرض کے لیے لوگوں کو بلایا جائے گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ بجالائیں۔ جو لوگ دنیا میں عبادت گزار تھے وہ سج دہ ریز ہو جائیں گے اور جنہوں نے دنیا میں اللہ کے آگے سر نیاز جھکانے سے انکار کیا تھا ان کی کمر تختہ ہو جائے گی اور ان کے لیے یہ ممکن نہ ہو گا کہ وہاں عبادت گزار ہونے کا جھوٹا مظاہرہ کر سکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

استادِ محترم پروفیسر حافظ احمد یار صاحب مرحوم نے کشفِ ساق کے محاورے کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ عرب کے لوگوں کا لباس ٹخنوں تک ہوتا ہے۔ جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تھا یا ڈاکو آجاتے تھے تو یہ لوگ اپنے کپڑے گھٹنوں کے اوپر باندھ کر لڑنے کے لیے یا بھاگنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اس طرح کشف ساق کے محاورے میں کسی کام کے لیے تیار ہو جانے کا مفہوم ہے۔ حافظ صاحب کی اس وضاحت سے ذہن اردو محاورے کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے اردو میں ہم کہتے ہیں، کسی کام کے لیے کمر کس لینا۔ بہر حال حافظ صاحب کی وضاحت کے مطابق اس آیت کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ جس دن دوبارہ زندہ کر کے اللہ کے حضور پیش کرنے کے لیے لوگوں کو تیار کیا جائے گا اور اس تیاری کا پہلا مرحلہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اس وقت دو قومی نظریہ کھل کر سامنے آجائے گا۔

آیت نمبر (44تا52)

ترجمہ

فَذَرْنِيْ	وَمَنْ يُّكَذِّبُ	بِهٰذَا الْحَدِيْثِ ؕ	سَنَسْتَدْرِجُهُمْ
تو آپ چھوڑ دیں مجھ کو	اور اس کو جو جھٹلاتا ہے	اِس بات (قرآن) کو	ہم بتدریج لے جائیں گے ان کو (خسران میں)

مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ﴿۴۴﴾	وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ	اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۴۵﴾
جہاں سے یہ لوگ جانتے نہیں ہیں	اور میں ڈھیل دیتا ہوں ان کو	بیشک میری تدبیر بڑی پکی ہے

اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا	فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ	مُّثْقَلُوْنَ ﴿۴۶﴾	اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ
یا آپؐ مانگتے ہیں ان سے کوئی اجرت	تو وہ تاوان سے	لدے ہوئے ہیں	یا ان کے پاس غیب (کی خبر) ہے

فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿۴۷﴾	فَاصْبِرْ	لِحُكْمِ رَبِّكَ	وَلَا تَكُنْ	كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ۘ
تو وہ لوگ لکھتے ہیں	تو آپؐ ثابت قدم (منتظر) رہیں	اپنے رب کے حکم کے	اور آپؐ مت ہوں	مچھلی والے (یونسؑ) کی طرح

اِذْ نَادٰى	وَهُوَ مَكْظُوْمٌ ﴿۴۸﴾ ؕ	لَوْ لَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ	نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
جب انہوںؑ نے پکارا (رب کو)	اس حال میں کہ وہ غم زدہ تھے	اگر نہ ہوتا کہ آلیا انؑ کو	ایک نعمت نے ان کے رب (کے پاس) سے

لَنُبِذَ	بِالْعَرَآءِ	وَهُوَ مَذْمُوْمٌ ﴿۴۹﴾
تو ضرور وہ پھینکے گئے رہتے	اُس چٹیل میدان میں	اس حال میں کہ وہ مذمت کیے ہوئے ہوتے

فَاجْتَبٰهُ رَبُّهٗ	فَجَعَلَهٗ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۵۰﴾	وَاِنْ يَّكَادُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	لَيُزْلِقُوْنَكَ
پھر نوازا انؑ کو ان کے رب نے	تو اس نے کر دیا انؑ کو نیک لوگوں میں سے	اور بیشک ایسے لگتا ہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا	کہ وہ ضرور پھسلا دیں آپؐ کو

بِاَبْصَارِهِمْ	لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ	وَيَقُوْلُوْنَ
اپنی (غضبناک) نظروں سے	جب وہ سنتے ہیں اس یاددہانی (قرآن) کو	اور وہ لوگ کہتے ہیں

اِنَّهٗ لَمَجْنُوْنٌ ﴿۵۱﴾ ۘ	وَمَا هُوَ	اِلَّا ذِكْرٌ	لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۵۲﴾ ع
بیشک یہ ضرور مجنون ہے	حالانکہ نہیں ہے وہ	سوائے ایک ایسی یاددہانی ہے جو	تمام جہانوں کے لیے ہے

نوٹ: 1

آیت۔44۔ میں ہے کہ آپؐ جھٹلانے والوں کو اور مجھے چھوڑ دیں۔ یہاں چھوڑنا ایک محاورہ کے طور پر فرمایا گیا ہے۔ مراد اس سے اللہ پر بھروسہ کرنا ہے۔ اور اس کا حاصل کلام یہ ہے کہ کفار کی طرف سے یہ مطالبہ بھی پیش ہوا کرتا تھا کہ اگر ہم واقعی اللہ کے مجرم ہیں اور اللہ تعالیٰ ہمیں عذاب دینے پر قادر ہے تو پھر ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔ اس پر یہ فرمایا گیا کہ اپنی حکمت کو ہم خوب جانتے ہیں۔ ایک حد تک مہلت دیتے ہیں اور فوراً عذاب نہیں بھیج دیتے۔ پھر حضرت یونسؑ کے واقعہ کا ذکر فرما کر آنحضرت ﷺ کو نصیحت فرمائی کہ آپؐ ان لوگوں کے ایسے مطالبہ سے مغلوب نہ ہوں اور ان پر جلدی عذاب نازل کرنے کے خواہشمند نہ ہوں۔ اپنی حکمتوں، مصلحتوں کو ہم ہی جانتے ہیں۔ ہم پر توکل کریں۔ (معارف القرآن)۔

بے خبری میں بتدریج کسی کو تباہی کی طرف لے جانے کی صورت یہ ہے کہ ایک حق کے دشمن اور ظالم کو دنیا میں نعمتوں سے نوازا جائے، صحت، مال، اور دنیوی کامیابیاں عطا کی جائیں۔ جن سے دھوکا کھا کر وہ سمجھے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں خوب کر رہا ہوں۔ اس طرح وہ ظلم وطغیان میں زیادہ سے زیادہ غرق ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ نہیں سمجھتا کہ جو نعمتیں اسے مل رہی ہیں وہ انعام نہیں ہیں بلکہ اس کی ہلاکت کا سامان ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل ایمان میں سے کسی کو اگر اللہ تعالیٰ دنیوی کامیابیوں اور یہاں کی نعمتوں سے نوازتا ہے تو یہ اس کا انعام ہیں۔ قرآن مجید میں کم از کم دو مقامات، الانفال۔28۔ اور التغابن۔15، میں براہِ راست اہل ایمان کو خطاب کر کے خبردار کیا گیا ہے کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد یعنی دنیا کی نعمتیں فتنہ یعنی آزمائش ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ جو ان آزمائشوں میں پورا اترے گا تو یہ دنیوی نعمتیں اس کی آخرت کی کامیابیوں اور انعام کا ذریعہ بن جائیں گی، ناکامی کی صورت میں یہی نعمتیں آخرت میں ناکامی اور خسارے کا باعث ہوں گی۔ (مرتب)

نوٹ:2

آیت۔49۔کوسورۃ الصّافات کی آیت۔142۔146 کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ 6892 میں ڈالے گئے تھے اس وقت تو وہ ملامت میں مبتلا تھے،لیکن جب انہوں نے اللہ کی تسبیح کی اور اپنے قصور کا اعتراف کرلیا تو اگرچہ وہ مچھلی کے پیٹ سے نکال کر بڑی سقیم حالت میں ایک چٹیل زمین پر پھینکے گئے تھے،مگر وہ اس وقت مذمت میں مبتلا نہ تھے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے اس جگہ ایک بیلدار درخت اگا دیا، تا کہ اس کے پتے ان پر سایہ کریں اور وہ اس کے پھل سے اپنی بھوک پیاس بھی دور کرسکیں۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔51۔کا تعلق بھی صبر وثبات کی تلقین کے اس مضمون ہی سے ہے جو فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ میں بیان ہوا ہے۔یعنی اگرچہ حالات نہایت سخت ہیں کہ کفار جب قرآن سنتے ہیں تو تمہیں اس طرح گھورتے ہیں جیسے وہ اپنی نگاہوں کے زور سے تمہیں دھکیل کر تمہارے مقام سے تم کو پھسلا دیں گے اور جوش غضب میں تمہیں خبطی اور مجنون بتاتے ہیں لیکن ان کے اس رویہ کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہو۔ یہاں ابتدائے سورہ کی آیت مَا اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ، ذہن میں تازہ کر لیجئے۔سورہ جس مضمون سے شروع ہوئی تھی اسی پر ختم ہورہی ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:4

آیات۔51۔52 کے ضمن میں کچھ مفسرین نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔انسان کی نظر بدلگ جانا اور اس سے کسی انسان کو نقصان اور بیماری بلکہ ہلاکت تک پہنچ جانا حقیقت ہے اور احادیث میں اس کا حق ہونا وارد ہے۔ یہ بات عرب میں بھی معروف ومشہور تھی اور مکہ میں ایک شخص نظر لگانے میں بڑا مشہور تھا۔اونٹوں یا جانوروں کو نظر لگا دیتا تو وہ ہلاک ہوجاتے۔ کفارِ مکہ کو رسول اللہ ﷺ سے عداوت تو تھی ہی اور وہ آپ کو ایذاء پہنچانے کی ہر طرح کی کوشش کیا کرتے تھے۔ان کو یہ سوجھی کہ اُس شخص سے رسول اللہ ﷺ کو نظر لگواؤ۔تو لوگ اس کو بلا لائے۔اس نے نظر بد لگانے کی اپنی پوری کوشش کر لی مگر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کی حفاظت فرمائی۔ یہ آیات اسی سلسلہ میں نازل ہوئیں اور لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ میں اسی نگاہ بدلگانے کو بیان فرمایا گیا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ سے منقول ہے کہ جس شخص کو کسی انسان کی نظر بدلگ گئی ہو اس پر یہ آیات پڑھ کر دم کر دینا اس کے اثر کو زائل کر دیتا ہے۔(معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ الحاقۃ (69)

آیت نمبر (1 تا 12)

ح	س	م

(ض) حَسْمًا کسی چیز کو جڑ سے کاٹ دینا

حُسُوْمٌ صفت ہے۔نامبارک۔منحوس۔زیر مطالعہ آیت۔7

ص ر ع

6892

(ف) صَرْعًا زمین پر پٹخ دینا۔ پچھاڑنا

صَرِیْعٌ ج صَرْعٰی ۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت ہے اسم المفعول کے معنی میں۔ پٹخا ہوا۔ پچھاڑا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔7

ترجمہ

اَلْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾	مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ؕ﴿۳﴾
وہ ثابت ہونے والی	کیا ہے وہ ثابت ہونے والی	اور تم کیا جانو کیا ہے وہ ثابت ہونے والی (قیامت)

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ	بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾	فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا	بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾
جھٹلایا ثمود نے اور عاد نے	اس کھٹکھٹانے والی (قیامت) کو	پس وہ جو ثمود تھے تو ان کو ہلاک کیا گیا	حد سے گزرنے والی (چنگھاڑ) سے

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا	بِرِيْحٍ	صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾	سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ
اور وہ جو عاد تھے تو ان کو ہلاک کیا گیا	ایک ایسی ہوا سے جو	حد سے زیادہ تیز و تند تھی	اس (اللہ) نے مطیع (مسلط) کیا اس (ہوا) کو ان لوگوں پر

سَبْعَ لَيَالٍ	وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ	حُسُوْمًا ۙ	فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا	صَرْعٰى ۙ
سات راتوں	اور آٹھ دنوں تک	منحوس ہوتے ہوئے	پس تو دیکھتا ہے اُس قوم کو اُس (سرزمین) میں	پچھاڑے ہوئے

كَاَنَّهُمْ	اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾	فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ	مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾
جیسے کہ وہ ہوں	کچھ اوندھی ہونے والی کھجوروں کے تنے	تو کیا تو دیکھتا ہے ان لوگوں کی	کوئی بھی باقی رہنے والی (جان)

وَجَآءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ	وَ الْمُؤْتَفِكٰتُ	بِالْخَاطِئَةِ ۚ﴿۹﴾	فَعَصَوْا
اور آیا فرعون اور وہ لوگ جو اس سے پہلے تھے	اور الٹنے والی بستیوں (والے)	(ہر ایک) خطا کرنے والی (جان) کے ساتھ	پھر ان لوگوں نے نافرمانی کی

رَسُوْلَ رَبِّهِمْ	فَاَخَذَهُمْ	اَخْذَةً رَّابِيَةً ﴿۱۰﴾	اِنَّا لَمَّا
اپنے رب کے رسول کی	تو اس نے پکڑا ان کو	ایک اٹھنے والی (شدید) پکڑ میں	بیشک ہم نے، اس وقت جب

طَغَا الْمَآءُ	حَمَلْنٰكُمْ	فِي الْجَارِيَةِ ۙ﴿۱۱﴾
جوش میں آیا پانی	سوار کیا تم لوگوں کو	اُس جاری ہونے والی (کشتی) میں

لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ	تَذْكِرَةً	وَّ تَعِيَهَآ	اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ﴿۱۲﴾
تاکہ ہم بنائیں اس (کشتی) کو تمہارے لیے	ایک یاددہانی	اور تاکہ یاد رکھے اس کو	کوئی یاد رکھنے والا کان

نوٹ:1 سابقہ سورہ القلم سے اس سورہ کو گہری مناسبت ہے۔ دونوں کا عمود (یعنی مرکزی موضوع) ایک ہی ہے یعنی اثبات عذاب (دنیا میں آنے والے عذاب) اور قیامت (دنیا کا خاتمہ)۔ البتہ نہج استدلال دونوں میں الگ الگ ہے۔ قرآن کی عظمت وصداقت جس طرح سابق سورہ میں واضح کی گئی ہے اور اس کی تکذیب کے نتائج سے ڈرایا گیا ہے، اسی طرح اِس سورہ میں بھی یہی مضمون زیر بحث آیا ہے۔ بس یہ فرق ہے کہ سابق سورہ

میں یہ مضمون تمہید کی حیثیت سے ہے اور اس سورہ میں اختتام کے طور پر ہے۔ تذکیر و تعلیم کے پہلو سے ان دونوں اسلوبوں کی اہمیت الگ الگ ہے۔ (تدبر قرآن)۔ 6892

نوٹ:2 کفار مکہ چونکہ قیامت کو جھٹلا رہے تھے اور اس کے آنے کی خبر کو مذاق سمجھتے تھے اس لیے پہلے ان کو خبردار کیا گیا کہ وہ تو ہونی شدنی ہے، تم چاہے مانو یا نہ مانو، وہ بہرحال آ کر رہے گی۔ اس کے بعد ان کو بتایا گیا کہ یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ہے کہ کوئی شخص ایک پیش آنے والے واقعہ کی خبر کو تسلیم کرتا ہے یا نہیں، بلکہ اس کا نہایت گہرا تعلق قوموں کے اخلاق اور پھر ان کے مستقبل سے ہے۔ تم سے پہلے گزری ہوئی قوموں کی تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم نے بھی آخرت کا انکار کر کے اسی دنیا کی زندگی کو اصل زندگی سمجھا اور اس بات کو جھٹلا دیا کہ انسان کو آخر کار خدا کی عدالت میں اپنا حساب دینا ہوگا، وہ سخت اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہوئی، یہاں تک کہ خدا کے عذاب نے آ کر دنیا کو اس کے وجود سے پاک کر دیا۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (13 تا 37)

و ھـ ی

(ض۔ح) وَهْيًا — کسی چیز کا بوسیدہ ہو کر پھٹ جانا۔ شگاف پڑنا۔ بوسیدہ ہونا۔

وَاهِيَةٌ — مؤنث وَاهِيَةٌ۔ اسم الفاعل ہے۔ پھٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ق ط ف

(ض) قَطْفًا — پھل چننا۔

قِطْفٌ — ج قُطُوْفٌ۔ اسم ذات ہے۔ پھل۔ میوہ۔ زیر مطالعہ آیت۔33۔

ح ض ض

(ن) حَضًّا — کسی کام پر اکسانا۔ ترغیب دینا۔ زیر مطالعہ آیت۔34۔

(تفاعل) تَحَاضًّا — ایک دوسرے کو ترغیب دینا۔ ﴿وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝﴾ (89/الفجر:18) ''اور تم لوگ باہم ترغیب نہیں دیتے مسکین کے کھانا (کھلانے) پر۔ تَحٰضُّوْنَ دراصل تَتَحٰضُّوْنَ ہے جس کی ایک تا گری ہوئی ہے۔

ترکیب (آیت۔13) آگے قیامت کے واقعات کا ذکر ہے اس لیے بھی (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:27) اور بات اِذَا شرطیہ سے شروع ہو رہی ہے، اس لیے بھی آگے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔ نُفِخَ کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے نَفْخَةٌ حالت رفع میں ہے۔ (آیت۔14) دُكَّتَا تثنیہ مؤنث کا صیغہ ہے۔ اس کا نائب فاعل اس میں شامل هُمَا کی ضمیر ہے جو اَلْاَرْضُ وَالْجِبَالُ کے لیے ہے اور محلاً حالت رفع میں ہے۔ دَكَّةً اس کا مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت۔17) وَالْمَلَكُ پر الف لام کو لام تعریف بھی مانا جا سکتا ہے اور لامِ جنس بھی۔ ترجمے میں ہم لام جنس کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔18) ثلاثی مجرد اور باب افعال، دونوں کا مضارع مجہول ہم شکل ہو جاتا ہے۔ عبارت کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہاں تُعْرَضُوْنَ باب افعال کا نہیں بلکہ ثلاثی مجرد کا مضارع مجہول ہے۔ خَفِيَ کے

ساتھ صلہ کے استعمال سے مفہوم بدلتا ہے۔ خَفِیَ عَلَیْہِ (پوشیدہ ہوا اس پر یعنی اس سے پوشیدہ ہوا۔) خَفِیَ مِنْہُ۔ (پوشیدہ ہوا اس سے یعنی اس کا کوئی کام پوشیدہ ہوا) ترجمہ کرتے وقت اردو محاورے کا لحاظ کرنا ہوگا (آیت۔19) اُوْتِیَ کا نائب فاعل مَنْ ہے جو محلاً حالتِ رفع میں ہے، جبکہ کِتٰبَہٗ میں کِتٰبُ مفعول ثانی ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ کِتٰبِیَہْ دراصل کِتَابِیْ ہے جس پر ہائے سکت لگی ہوئی ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ259، نوٹ۔2)۔ اسی طرح آگے حِسَابِیَہْ۔ مَالِیَہْ۔ سُلْطٰنِیَہْ وغیرہ میں بھی یائے متکلم کے آگے ہائے سکت لگی ہے۔ نوٹ کرلیں کہ تائے تانیث پر جب وقف کرتے ہیں تو وہ بھی ہا کی آواز دیتی ہے لیکن کتابت میں اس پر تا کے دو نقطے آتے ہیں جیسے رَاضِیَۃٍ۔ عَالِیَۃٍ۔ دَانِیَۃٍ۔ اَلْقَاضِیَۃَ وغیرہ۔ جب کہ ہائے سکت نقطوں سے خالی ہوتی ہے۔ (آیت۔27) کَانَتْ کا اسم اس میں شامل ھِیَ کی ضمیر ہے جب کہ اَلْقَاضِیَۃَ اس کی خبر ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ	نَفْخَۃٌ وَّاحِدَۃٌ ﴿۱۳﴾	وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ
پھر جب پھونکا جائے گا صور میں	ایک ہی بار پھونکنا	اور اٹھائی جائے گی یہ زمین اور سارے پہاڑ

فَدُكَّتَا	دَكَّۃً وَّاحِدَۃً ﴿۱۴﴾	فَیَوْمَئِذٍ وَّقَعَتِ	الْوَاقِعَۃُ ﴿۱۵﴾	وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ
پھر وہ دونوں کوٹ کر ہموار کیے جائیں گے	ایک ہی بار ہموار کرنا	تو اُس دن واقع ہوگی	وہ واقع ہونے والی (قیامت)	اور پھٹ جائے گا آسمان

فَهِیَ یَوْمَئِذٍ	وَّاهِیَۃٌ ﴿۱۶﴾	وَّالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا	وَیَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ
تو وہ (آسمان) اُس دن	بوسیدہ ہوگا	اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے	اور اٹھائیں گے تیرے رب کا عرش

فَوْقَهُمْ یَوْمَئِذٍ	ثَمٰنِیَۃٌ ﴿۱۷﴾	یَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ	لَا تَخْفٰی	مِنْكُمْ خَافِیَۃٌ ﴿۱۸﴾
اپنے اوپر اس دن	آٹھ (فرشتے)	اس دن تم لوگ سامنے لائے جاؤ گے	چھپی نہیں ہوگی	تمہاری کوئی چھپنے والی (بات)

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ	كِتٰبَهٗ بِیَمِیْنِهٖ	فَیَقُوْلُ هَآؤُمُ	اقْرَءُوْا كِتٰبِیَهْ ﴿۱۹﴾	اِنِّیْ ظَنَنْتُ
پس وہ جو ہے جس کو دی گئی	اس کی کتاب اس کے داہنے ہاتھ میں	تو وہ کہے گا یہ لو	پڑھو میری کتاب	بیشک میں نے خیال کیا

اَنِّیْ مُلٰقٍ	حِسَابِیَهْ ﴿۲۰﴾	فَهُوَ فِیْ عِیْشَۃٍ رَّاضِیَۃٍ	فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ ﴿۲۲﴾
کہ میں ملاقات کرنے والا ہوں	اپنے حساب سے	تو وہ من بھاتی زندگی گزارنے میں ہے	اونچا ہونے والے باغ میں

قُطُوْفُهَا دَانِیَۃٌ ﴿۲۳﴾	كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	هَنِیْٓـًٔا	بِمَآ اَسْلَفْتُمْ
جس کے میوے قریب ہونے والے (جھکے ہوئے) ہوں گے	(کہا جائے گا) تم لوگ کھاؤ اور پیو	خوشگوار ہوتے ہوئے	بسبب اس کے جو تم لوگوں نے آگے بھیجا

فِی الْاَیَّامِ الْخَالِیَۃِ ﴿۲۴﴾	وَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ	كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ	فَیَقُوْلُ
گزرنے والے دنوں میں	اور وہ جو ہے جس کو دی گئی	اس کی کتاب اس کے بائیں ہاتھ میں	تو وہ کہے گا

یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُوْتَ	كِتٰبِیَهْ ﴿۲۵﴾	وَلَمْ اَدْرِ	مَا حِسَابِیَهْ ﴿۲۶﴾	یٰلَیْتَهَا كَانَتِ
اے کاش مجھ کو دی ہی نہ جاتی	میری کتاب	اور میں جانتا ہی نہ	کیا ہے میرا حساب	اے کاش وہ (موت ہی) ہوتی

الْقَاضِيَةَ ﴿۲۷﴾	مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ	مَالِيَهْ ﴿۲۸﴾	هَلَكَ عَنِّيْ	سُلْطٰنِيَهْ ﴿۲۹﴾
فیصلہ کرنے (قصہ چکانے) والی	کیا کام آیا میرے	میرا مال	ہلاک (زائل) ہوا مجھ سے	میرا اختیار

خُذُوْهُ	فَغُلُّوْهُ ﴿۳۰﴾	ثُمَّ الْجَحِيْمَ	صَلُّوْهُ ﴿۳۱﴾	ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ
(کہا جائے گا) پکڑو اس کو	پھر طوق پہناؤ اس کو	پھر دہکتی آگ میں	تم لوگ بھونو اس کو	پھر ایک ایسی زنجیر میں

ذَرْعُهَا	سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا	فَاسْلُكُوْهُ ﴿۳۲﴾	اِنَّهٗ	كَانَ لَا يُؤْمِنُ
جس کی لمبائی	ستر ہاتھ ہے	تم لوگ ڈالو (جکڑو) اس کو	بیشک وہ	ایمان نہیں لاتا تھا

بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۳﴾	وَلَا يَحُضُّ	عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ﴿۳۴﴾	فَلَيْسَ لَهُ
اس عظیم اللہ پر	اور ترغیب نہیں دیتا تھا (کسی کو)	مسکین کے کھانا (کھلانے) پر	تو نہیں ہے اس کے لیے

الْيَوْمَ هٰهُنَا	حَمِيْمٌ ﴿۳۵﴾	وَّلَا طَعَامٌ	اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ﴿۳۶﴾	لَّا يَاْكُلُهٗٓ	اِلَّا الْخَاطِـُٔوْنَ ﴿۳۷﴾
آج یہاں	کوئی گرم جوش (دوست)	اور نہ چکھنے کی کوئی چیز	سوائے زخموں کے میل کچیل میں سے	نہیں کھاتے اس کو مگر	خطا (گناہ) کرنے والے

نوٹ:1

زیر مطالعہ آیات کو پڑھتے ہوئے یہ بات ذہن میں ہونی چاہیے کہ قرآن مجید میں کہیں تو قیامت کے تین مراحل الگ الگ بیان کیے گئے ہیں جو یکے بعد دیگرے مختلف اوقات میں پیش آئیں گے۔ اور کہیں پہلے مرحلے سے آخری مرحلے تک کے واقعات کو سمیٹ کر یکجا کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ نمل آیت۔ 87۔ میں پہلے نَفَخِ صور کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب تمام دنیا کے انسان یک لخت ایک ہولناک آواز سے گھبرا اٹھیں گے۔ اس وقت نظام عالم کے درہم برہم ہونے کی وہ کیفیات ان کی آنکھوں کے سامنے پیش آئیں گی جو سورۂ حج آیات۔ 1، 2، سورۂ یٰسین آیات۔ 49۔ 50، اور سورۂ تکویر آیات۔ 1 تا 6 میں بیان ہوئی ہیں۔ سورۂ زمر آیات۔ 67 تا 70۔ میں دوسرے اور تیسرے نَفَخِ صور کے متعلق بتایا گیا ہے کہ ایک نفخ پر سب لوگ مر کر گر جائیں گے اور اس کے بعد جب دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب جی اٹھیں گے اور خدا کی عدالت میں پیش ہو جائیں گے۔ سورۂ طٰہٰ آیات۔ 102 تا 112، سورۂ انبیاء آیات۔ 101 تا 103، سورۂ یٰسین آیات۔ 51 تا 53، اور سورۂ ق آیات۔ 20 تا 22 میں صرف تیسرے نَفَخِ صور کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں اور دوسرے مقامات پر قرآن میں پہلے نَفَخِ صور سے لے کر جنت اور جہنم میں لوگوں کے داخل ہونے تک کے تمام واقعات کو ایک ہی سلسلہ میں بیان کر دیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

قرآن مجید میں قیامت کے جو احوال بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق متشابہات سے ہے۔ ہمارے فہم سے قریب لانے کے لیے ان کو ایسے لفظوں میں بیان کیا جاتا ہے جن سے ان کا ایک تصور ہمارے ذہن میں قائم ہو سکے۔ یہ احوال ایک نادیدہ عالم کے ہیں، ان کا تصور دینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ ان کی اصل حقیقت کا جاننا اس عالم میں ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے متعلق یہ ہدایت دی ہے کہ وہ جس طرح بیان ہوئے ہیں، اسی طرح ان پر اجمالی ایمان رکھا جائے۔ ان کی اصل حقیقت کے درپے نہ ہوا جائے ورنہ اندیشہ ہے کہ آدمی کسی فتنہ میں پڑ جائے۔ (تدبر قرآن)۔

قیامت کے روز عرش رحمٰن کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ بعض روایاتِ حدیث میں ہے کہ قیامت سے پہلے تو یہ کام

چار فرشتوں کے سپرد ہے۔ قیامت کے روز ان کے ساتھ چار اور بڑھا دیئے جائیں گے۔ رہا یہ معاملہ کہ عرش رحمٰن کیا چیز ہے اور اس کی حقیقت 6892 اور شکل وصورت کیا ہے اور فرشتوں کا اس کو اٹھانا کس صورت سے ہے، یہ سب چیزیں وہ ہیں کہ عقل انسانی ان کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ ان مباحث میں پڑنے، ان پر غور وفکر کرنے اور سوالات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ صحابہ اور تابعین کا مسلک اس جیسے تمام معاملات میں یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے کہ اس سے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی مراد ہے وہ حق ہے اور اس کی حقیقت وکیفیت نامعلوم ہے۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 3

سیدھے ہاتھ میں نامۂ اعمال کا دیا جانا ہی ظاہر کر دے گا کہ اس کا حساب بے باق ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں مجرم کی حیثیت سے نہیں بلکہ صالح انسان کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ اعمال ناموں کی تقسیم کے وقت صالح انسان خود سیدھا ہاتھ بڑھا کر اپنا نامۂ اعمال لے گا، کیونکہ موت کے وقت سے میدان حشر میں حاضری تک اس کے ساتھ جو معاملہ پیش آیا ہوگا اس کی وجہ سے اس کو پہلے ہی یہ اطمینان حاصل ہو چکا ہوگا کہ میں یہاں انعام پانے کے لیے پیش ہو رہا ہوں نہ کہ سزا پانے کے لیے۔ قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ بڑی صراحت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ موت کے وقت ہی سے یہ بات انسان پر واضح ہو جاتی ہے کہ وہ نیک بخت آدمی کی حیثیت سے دوسرے عالم میں جا رہا ہے یا بد بخت آدمی کی حیثیت سے۔ پھر موت سے قیامت تک نیک انسان کے ساتھ مہمان کا سا معاملہ ہوتا ہے اور بد انسان کے ساتھ حوالاتی مجرم کا سا۔ اس کے بعد جب قیامت کے روز دوسری زندگی کا آغاز ہوتا ہے اسی وقت سے صالحین کی حالت وکیفیت کچھ اور ہوتی ہے جبکہ کفار، منافقین اور مجرمین کی کچھ اور۔

سورۂ انشقاق میں فرمایا گیا ہے ''اور جس کا نامۂ اعمال اس کی پیٹھ کے پیچھے دیا جائے گا'' غالباً اس کی صورت یہ ہوگی کہ مجرم کو چونکہ پہلے ہی سے اپنے مجرم ہونے کا علم ہوگا اور وہ جانتا ہوگا کہ اس کے نامۂ اعمال میں اس کا سارا کچا چٹھا درج ہے اس لیے وہ نہایت بے دلی کے ساتھ اپنا بایاں ہاتھ بڑھا کر اسے لے گا اور فوراً پیٹھ کے پیچھے چھپا لے گا تا کہ کوئی دوسرا اسے دیکھنے نہ پائے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (36 تا 43)

و ت ن

وُتُوْنًا — پانی کا ہمیشہ بہنا اور نہ رکنا۔

وَتِیْنٌ — فَعِیْلٌ کا وزن ہے لیکن یہ اسم ذات ہے۔ دل کی رگ جس سے تمام رگوں میں خون جاتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت۔46۔

ترکیب

آیت۔45) اس میں یہ نہیں کہا کہ لَاَخَذْنَاہُ بلکہ ضمیر مفعولی کے ساتھ مِنْ لگا دیا ہے کیونکہ کسی کو جب پکڑتے ہیں تو اس کا پورا جسم نہیں پکڑتے بلکہ جسم کا کوئی حصہ جیسے گردن یا ہاتھ وغیرہ پکڑتے ہیں۔ بالیمین (داہنے ہاتھ سے)۔ اس سے مراد ہے قوت سے۔ طاقت سے۔ (حافظ احمد یار صاحب کے کیسٹ سے ماخوذ)۔ اس آیت کے ترجمہ سے متعلق تدبر قرآن میں ہے کہ عام طور پر لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا ہے ''ہم اس کا (پیغمبر کا) داہنا ہاتھ پکڑتے'' لیکن عربیت کے قاعدے سے اس کا ترجمہ ہونا چاہیے ''ہم اس کو اپنے قوی بازو سے پکڑتے۔'' اور تفسیر ابن جریر سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ (آیت۔47) لفظ اَحَدٌ میں کبھی جمع کا مفہوم ہوتا ہے۔ جیسے ہم کہیں کہ تم لوگوں میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ تم سب کے سب ایسے نہیں ہو۔ اس طرح اس جملہ میں لفظ ایک جمع کے مفہوم میں ہے۔ اس آیت میں بھی مِنْ اَحَدٍ جمع کے مفہوم میں ہے، اس لیے حَاجِزًا (واحد) کے بجائے حَاجِزِیْنَ (جمع) آیا ہے۔

ترجمہ

1892

فَلَآ	اُقۡسِمُ	بِمَا تُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۳۸﴾	وَ مَا لَا تُبۡصِرُوۡنَ ۙ﴿۳۹﴾	اِنَّهٗ
پس نہیں!	میں قسم کھاتا ہوں	اس کی جو تم لوگ دیکھتے ہو	اور اس کی جو تم لوگ نہیں دیکھتے	بیشک یہ (قرآن)

لَقَوۡلُ رَسُوۡلٍ كَرِيۡمٍ ۚ﴿۴۰﴾	وَّ مَا هُوَ	بِقَوۡلِ شَاعِرٍ ؕ	قَلِيۡلًا مَّا	تُؤۡمِنُوۡنَ ۙ﴿۴۱﴾
یقیناً ایک بزرگ رسول کا کہا ہوا ہے	اور یہ (قرآن)	کسی شاعر کا کہا ہوا نہیں ہے	بہت ہی تھوڑا سا	تم لوگ ایمان لاتے ہو

وَ لَا بِقَوۡلِ كَاهِنٍ ؕ	قَلِيۡلًا مَّا	تَذَكَّرُوۡنَ ؕ﴿۴۲﴾	تَنۡزِيۡلٌ	مِّنۡ رَّبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۴۳﴾
اور نہ کسی کاہن کا کہا ہوا ہے	بہت ہی تھوڑی سی	تم لوگ نصیحت پکڑتے ہو	(یہ) اتارا ہوا ہے	تمام جہانوں کے رب (کی طرف) سے

وَ لَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا	بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ ۙ﴿۴۴﴾	لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ	بِالۡيَمِيۡنِ ۙ﴿۴۵﴾
اور اگر وہ غلط منسوب کرتے ہم پر	باتوں کی کوئی (بات)	تو ہم ضرور پکڑتے اس کو	داہنے ہاتھ (پوری طاقت) سے

ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ	الۡوَتِيۡنَ ۖ﴿۴۶﴾	فَمَا مِنۡكُمۡ	مِّنۡ اَحَدٍ	عَنۡهُ حٰجِزِيۡنَ ﴿۴۷﴾
پھر ہم ضرور کاٹ دیتے اس سے	(اس کی) رگ دل کو	تو نہ ہوتا تم میں سے	کوئی ایک بھی	اس سے روکنے والا

وَ اِنَّهٗ لَتَذۡكِرَةٌ	لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ﴿۴۸﴾	وَ اِنَّا لَنَعۡلَمُ	اَنَّ مِنۡكُمۡ
اور بیشک یہ (قرآن) یقیناً ایک یاددہانی ہے	متقی لوگوں کے لیے	اور بیشک ہم یقیناً جانتے ہیں	کہ تم میں سے

مُّكَذِّبِيۡنَ ﴿۴۹﴾	وَ اِنَّهٗ	لَحَسۡرَةٌ	عَلَى الۡكٰفِرِيۡنَ ﴿۵۰﴾
کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں (اس کو)	اور بیشک یہ (جھٹلانا) ضرور	ایک حسرت ہوگا	انکار کرنے والوں پر

وَ اِنَّهٗ لَحَقُّ الۡيَقِيۡنِ ﴿۵۱﴾	فَسَبِّحۡ	بِاسۡمِ رَبِّكَ الۡعَظِيۡمِ ﴿۵۲﴾ ع
اور بیشک یہ یقین کرنے کا حقدار ہے	تو پھر تو تسبیح کر	اپنے عظیم رب کے نام کی

نوٹ: 1 قسم سے پہلے اس طرح جو لاَ آیا کرتا ہے وہ نہ تو زائد ہوتا ہے اور نہ قسم کی نفی کے لیے، بلکہ یہ قسم سے پہلے مخاطب کی بات کی تردید کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں جہاں کوئی قسم کھائی گئی ہے بالعموم دعوے کی شہادت اور اس کی دلیل کے طور پر کھائی گئی ہے۔ یہاں اصل دعویٰ اثباتِ جزاء و سزا ہے۔ قیامت اور جزاء و سزا پر قرآن نے جو دلائل دیے ہیں وہ پچھلی سورتوں میں بھی گزر چکے ہیں اور اس سورہ میں بھی زیر بحث آئے ہیں۔ ان پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ ان کا تعلق آفاق و انفس کے ان شواہد سے بھی ہے جو آنکھوں سے دیکھے جاسکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات اور آخرت کے ان احوال سے بھی ہے جو آنکھوں سے تو نہیں دیکھے جاسکتی لیکن عقل سے سمجھے جاسکتے ہیں۔ اسی سورہ میں جزاء و سزا پر جو دلیل قائم کی گئی ہے وہ پہلے قوموں کی تاریخ اور ان کی تباہی کے آثار سے قائم کی گئی ہے۔ پھر عالم غیب کے وہ احوال سنائے گئے ہیں جن سے اصحاب الیمین اور اصحاب الشمال کو سابقہ پیش آنا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک کا تعلق اس عالم سے ہے جس کی گواہی تاریخ کے صفحات اور زمین کے آثار میں موجود ہے۔ اور دوسرے کا تعلق اس نادیدہ عالم سے ہے جس کو ہرچند یہاں آنکھوں سے تو نہیں دیکھا جاسکتا لیکن عقل اس کو تسلیم

کرتی ہے کیونکہ خالق کی صفات اور اس جہاں میں پیش آنے والے مکافاتِ عمل کے واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں۔ انہی دو طرح کی دلیلوں کو گواہی میں پیش کر کے منکروں کو آگاہ فرمایا ہے کہ قرآن جس جزاء وسزا سے تمہیں آگاہ کر رہا ہے وہ ایک حقیقت ہے۔ اس عالم مشہود اور عالم غیر مشہود کے دلائل اس کی تائید میں ہیں۔ اس کو کسی شاعر کا کلام قرار دے کر جھٹلانے کی کوشش مت کرو۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔40 میں رسول کریم سے مراد محمد ﷺ ہیں اور سورۂ تکویر (آیت۔19) میں اس سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ یہاں قرآن کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ کسی شاعر یا کاہن کا قول نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ کفار مکہ جبریلؑ کو نہیں بلکہ محمد ﷺ کو شاعر اور کاہن کہتے تھے جبکہ سورۂ تکویر میں قرآن کو رسول کریم کا قول کہنے کے بعد فرمایا گیا ہے کہ وہ رسول بڑی قوت والا ہے، صاحب عرش کے ہاں بلند مرتبہ ہے، وہاں اس کی بات مانی جاتی ہے، وہ امانت دار ہے اور محمد ﷺ نے اس کو روشن افق پر دیکھا ہے۔ قریب قریب یہی مضمون سورۂ نجم کی آیات۔5 تا10 میں حضرت جبریلؑ کے متعلق بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کو محمد ﷺ اور جبریلؑ کا قول کس معنی میں کہا گیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس کو حضورؐ کی زبان سے اور حضور ﷺ اسے جبریلؑ کی زبان سے سن رہے تھے۔ اس لیے ایک لحاظ سے یہ حضور ﷺ کا قول تھا اور دوسرے لحاظ سے جبریلؑ کا قول، لیکن آگے چل کر یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ فی الاصل یہ رب العالمین کا نازل کردہ ہے۔ خود رسول کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ یہ ان دونوں کا اپنا کلام نہیں ہے بلکہ پیغامبر ہونے کی حیثیت سے انہوں نے اس کو پیغام بھیجنے والے کی طرف سے پیش کیا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔44 تا47 میں ایک خاص واقعہ کے متعلق یہ فرمایا ہے کہ اگر خدانخواستہ معاذ اللہ رسول اللہ ﷺ اپنی طرف سے کوئی بات گھڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے تو آپ ﷺ کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا۔ اس میں کوئی عام ضابطہ بیان نہیں کیا گیا کہ جو شخص بھی نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے، ہمیشہ اس کو ہلاک ہی کر دیا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگوں نے نبوت کا جھوٹا دعویٰ کیا لیکن ان پر کوئی ایسا عذاب نہیں آیا۔ (معارف القرآن)۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ جس طرح بادشاہ ایک شخص کو کسی منصب پر مامور کر کے اور سند وفرمان وغیرہ دے کر کسی طرف روانہ کرتے ہیں۔ اب اگر اس شخص سے اُس خدمت میں کچھ خیانت ہوئی یا بادشاہ پر کچھ جھوٹ باندھنا اس سے ثابت ہوا تو اسی وقت بلا توقف اس کا تدارک کرتے ہیں۔ لیکن اگر سڑک کوٹنے والا مزدور یا جھاڑو دینے والا بھنگی بکتا پھرے کہ گورنمنٹ کا میرے لیے یہ فرمان ہے یا میرے ذریعہ سے یہ احکام دیئے گئے ہیں، تو کون اس کی بات پر کان دھرتا ہے اور کون اس کے دعوؤں سے تعرض کرتا ہے۔ بہرحال آیت ہذا میں حضور ﷺ کی نبوت پر استدلال نہیں کیا گیا ہے بلکہ یہ بتلایا گیا ہے کہ قرآن کریم خالص اللہ کا کلام ہے جس میں ایک حرف یا ایک شوشہ بھی نبی کریم ﷺ اپنی طرف سے شامل نہیں کر سکتے اور نہ آپ ﷺ کی یہ شان ہے کہ کوئی بات اللہ کی طرف منسوب کر دیں جو اس نے نہ کی ہو۔ تورات سفر استثناء کے اٹھارویں باب میں بیسواں فقرہ یہ ہے، لیکن وہ نبی ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اسے حکم نہیں دیا یا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ ہی قتل کیا جائے۔'' (ترجمہ شیخ الہند)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6892

سورۃ المعارج (70)

آیت نمبر (1 تا 18)

ع ھ ن

(ض) عَهۡنًا شاخ کا لچکنا اور ٹوٹنے کے قریب ہونا۔
عِهۡنٌ رنگی ہوئی اون۔ آیت۔ زیر مطالعہ۔ 9۔

ل ظ ی

(س) لَظٰی آگ کا بھڑکنا۔
لَظٰی آگ کا شعلہ جہنم کا اسم علم بھی ہے۔ زیر مطالعہ آیت۔ 15۔
(تفعل) تَلَظُّیًا غصّہ سے جل اٹھنا۔ ﴿فَاَنۡذَرۡتُکُمۡ نَارًا تَلَظّٰی ۚ﴾ (92/اللیل:14) ''تو میں نے خبردار کر دیا تم لوگوں کو ایک ایسی آگ سے جو غصّہ سے جل اٹھے گی۔''

ترکیب

(آیت۔2) لَیۡسَ لَهٗ میں ـهٗ کی ضمیر بِعَذَابٍ کے لیے ہے۔ (آیت۔3) مِنَ اللّٰهِ کا تعلق دَافِعٌ سے بھی مانا جا سکتا ہے۔ اس وقت معنی ہوں گے کہ اللہ سے بچانے والا کوئی نہیں ہوگا اور اس کا تعلق بِعَذَابٍ سے بھی مانا جا سکتا ہے۔ اس وقت معنی ہوں گے کہ وہ عذاب اللہ کی طرف سے واقع ہونے والا ہے۔ مِنَ اللّٰهِ سے زیادہ قریب ہونے کی وجہ سے دَافِعٌ سے اس کا متعلق ہونا قابل ترجیح تھا لیکن آگے کی عبارت کا تقاضہ ہے کہ اس کو بِعَذَابٍ سے متعلق مانا جائے۔ (آیت۔6۔7) یَرَوۡنَهٗ اور نَرٰىهُ دونوں کی ضمیر مفعولی یَوۡمٍ کے لیے ہے جس سے مراد عَذَابٌ وَاقِعٌ والا دن یعنی قیامت ہے۔ (آیت۔ 11) بَصَّرَ (باب تفعیل) کے دو مفعول آتے ہیں۔ کس کو دکھایا اور کیا دکھایا۔ یہاں اس کا مضارع مجہول آیا ہے۔ یُبَصَّرُوۡنَ میں شامل هُمۡ کی ضمیر اس کا مفعولِ اوّل ہے جو اب نائب فاعل کہلائے گا اور یہ ضمیر حَمِیۡمٌ کے لیے ہے۔ اس کے آگے هُمۡ کی ضمیر مفعولی اس کے مفعول ثانی کے لیے ہے۔ یہ ضمیر حَمِیۡمًا کے لیے ہے۔

ترجمہ

سَاَلَ سَآئِلٌۢ	بِعَذَابٍ	وَّاقِعٍ ۙ﴿۱﴾	لِّلۡکٰفِرِیۡنَ لَیۡسَ لَهٗ	دَافِعٌ ۙ﴿۲﴾
مانگا ایک مانگنے والے نے	ایک ایسا عذاب جو	واقع ہونے والا ہے	کافروں کے لیے نہیں ہے جس کو	کوئی دفع کرنے والا

مِّنَ اللّٰهِ ذِی الۡمَعَارِجِ ؕ﴿۳﴾	تَعۡرُجُ الۡمَلٰٓئِکَةُ وَالرُّوۡحُ
جو بلندیوں والے اللہ (کی طرف) سے ہوگا	چڑھیں گے فرشتے اور الروح (جبریلؑ)

اِلَیۡهِ فِیۡ یَوۡمٍ	کَانَ مِقۡدَارُهٗ	خَمۡسِیۡنَ اَلۡفَ سَنَةٍ ۚ﴿۴﴾	فَاصۡبِرۡ صَبۡرًا جَمِیۡلًا ﴿۵﴾
اس کی طرف ایک ایسے دن میں	ہے جس کے اندازے کا پیمانہ	پچاس ہزار سال ہے	تو آپ صبر کریں جیسے خوبصورت صبر کرنا ہوتا ہے

اِنَّهُمۡ یَرَوۡنَهٗ بَعِیۡدًا ۙ﴿۶﴾	وَّنَرٰىهُ قَرِیۡبًا ؕ﴿۷﴾	یَوۡمَ تَکُوۡنُ السَّمَآءُ	کَالۡمُهۡلِ ﴿۸﴾
بیشک وہ لوگ دیکھتے ہیں اس (قیامت) کو دور ہوتے ہوئے	اور ہم دیکھتے ہیں اس کو قریب	جس دن ہو جائے گا آسمان	پگھلی ہوئی دھات کی مانند

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ	كَالْعِهْنِ ۝٩	وَلَا يَسْـَٔلُ حَمِيْمٌ	حَمِيْمًا ۝١٠
اور ہو جائیں گے پہاڑ	رنگی ہوئی اون کی مانند	اور نہیں پوچھے گا کوئی دوست	کسی دوست سے (خیر خیریت)

يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ	يَوَدُّ الْمُجْرِمُ	لَوْ يَفْتَدِيْ
ان (دوستوں) کو دکھائے جائیں گے وہ سب (دوست)	تمنا کریں گے سارے مجرم	کاش وہ خود کو چھڑا لیں

مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ	بِبَنِيْهِ ۝١١	وَصَاحِبَتِهٖ	وَاَخِيْهِ ۝١٢
اس دن کے عذاب سے	بدلے میں دے کر اپنے بیٹے کو	اور اپنی ساتھ والی (بیوی) کو	اور اپنے بھائی کو

وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِيْ	تُـْٔوِيْهِ ۝١٣	وَمَنْ فِي الْاَرْضِ	جَمِيْعًا ۙ
اور اپنے اُس کنبے کو جو	ٹھکانہ دیتا تھا اس کو	اور ان کو جو زمین میں ہیں	سب کے سب کو

ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝١٤	كَلَّا ؕ	اِنَّهَا لَظٰى ۝١٥	نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝١٦
پھر وہ (فدیہ دینا) نجات دلائے اس کو	ہرگز نہیں	بیشک یہ آگ کی تپش ہے	اُدھیڑنے والی ہوتے ہوئے چمڑی کو

تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ	وَتَوَلّٰى ۝١٧	وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝١٨
وہ (تپش) بلائے گی اس کو جس نے پیٹھ پھیری	اور روگردانی کی	اور جمع کیا (مال) پھر محفوظ رکھا

نوٹ: 1

ایک دن کا ایک ہزار سال یا پچاس ہزار سال کے برابر ہونے کا کیا مفہوم ہے، اس کی ایک وضاحت آیت نمبر۔22 / 47، نوٹ۔2۔ میں کی جا چکی ہے جبکہ ہمارے طلباء کے علم میں یہ بات بھی ہونی چاہیے کہ ہمارے مفسرین نے ان آیات کو کس طرح سمجھا ہے اور ان کی کیا وضاحت کی ہے۔ چنانچہ اس موقع پر ہم مفسرین کی رائے نقل کر رہے ہیں

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب جس کا اوپر ذکر آیا ہے، اس کا وقوع اس روز ہوگا جس کی مقدار پچاس ہزار سال کی ہوگی۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس دن کے متعلق سوال کیا جس کی مقدار پچاس ہزار سال ہو گی کہ یہ دن کتنا دراز ہوگا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ یہ دن مومن پر اتنا ہلکا ہوگا کہ ایک نماز فرض ادا کرنے کے وقت سے بھی کم ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ایک حدیث میں ہے کہ یہ دن مومنین کے لیے اتنا ہوگا جتنا ظہر و عصر کے درمیان ہوتا ہے۔ ان روایات سے معلوم ہوا کہ اس دن کا یہ طول کہ پچاس ہزار سال کا ہوگا، ایک اضافی امر ہے، کہ کفار کے لیے اتنا دراز اور مومنوں کے لیے اتنا مختصر ہوتا۔

اس آیت میں ایک دن کی مقدار پچاس ہزار سال بتائی ہے، جبکہ سورۃ السجدہ کی آیت۔5 میں ایک ہزار سال آئے ہیں۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے ''تدبیر کرتے ہیں امر الٰہی کی آسمان سے زمین تک۔ پھر چڑھتے ہیں اس کی طرف ایک ایسے دن میں جس کی مقدار ایک ہزار سال ہے عام شمار کے اعتبار سے۔'' بظاہر ان دونوں آیتوں کے مضمون میں تضاد ہے۔ اس کا جواب گزشتہ روایات حدیث سے ہو گیا کہ اس دن کا طول مختلف گروہوں کے اعتبار سے مختلف ہوگا۔ کفار کے لیے پچاس ہزار سال کا اور مومنین صالحین کے لیے ایک نماز کا وقت۔ ان کے درمیان مختلف گروہ ہیں۔ ممکن ہے بعض کے لیے ایک ہزار سال کے برابر ہو۔ اور وقت کا دراز و مختصر ہونا۔ شدت و بے چینی اور عیش و آرام میں مختلف ہونا، مشہور و معروف ہے۔

سورۂ السجدہ کی جس آیت میں ایک ہزار سال کا دن بیان کیا گیا ہے، اس کی ایک توجیہہ تفسیر مظہری میں یہ بیان کی گئی ہے کہ اس آیت میں جس دن کا ذکر ہے وہ دنیا ہی کے دنوں کا ایک دن ہے، اس میں جبریلؑ اور فرشتوں کا آسمان سے زمین پر آنا پھر زمین سے آسمان پر واپس جانا اتنی بڑی مسافت کو طے کرتا ہے کہ انسان اگر طے کرتا تو اس کو ایک ہزار سال لگتے کیونکہ احادیث میں آیا ہے کہ آسمان سے زمین تک پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ اس طرح پانچ سو سال اوپر سے نیچے آنے کے اور پانچ سو واپس جانے کے، یہ کل ایک ہزار سال انسانی چال کے اعتبار سے ہیں۔ بالفرض اگر انسان اس مسافت کو طے کرتا تو آنے اور جانے میں ایک ہزار سال لگ جاتے۔ اگرچہ فرشتے اس مسافت کو بہت ہی مختصر وقت میں طے کر لیتے ہیں۔ تو سورۂ سجدہ میں دنیا ہی کے دنوں میں سے ایک دن کا بیان ہوا اور سورۂ معارف میں قیامت کے دن کا بیان ہے جو ایام دنیا سے بہت بڑا ہوگا اور اس کی درازی اور کوتاہی مختلف لوگوں پر اپنے اپنے حالات کے اعتبار سے مختلف محسوس ہوگی۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (19 تا 35)

ھ	ل	ع

(س) هُلْعًا گھبرانا۔ مشکل میں صبر نہ کرنا۔ بے صبرا ہونا۔

هُلُوْعٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ بہت گھبرانے والا۔ ذرا بھی صبر نہ کرنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔19۔

ترکیب

(آیات۔19 تا 21) هَلُوْعًا۔ جَزُوْعًا۔ مَنُوْعًا، یہ تینوں فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغے ہیں اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔22) اصول یہ ہے کہ جمع میں سے واحد کو مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن واحد میں سے جمع کو مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اس آیت میں اَلْمُصَلِّيْنَ جمع ہے جس کو اَلْاِنْسَانَ میں سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اَلْاِنْسَانَ پر لام تعریف نہیں بلکہ لامِ جنس ہے۔ (آیت۔28) اَمِنَ، یَأْمَنُ کے معروف معنی ہیں ''امن میں ہونا''۔ اس معنی میں یہ فعل لازم ہے جس کا مفعول مَأْمُوْنٌ نہیں آتا۔ لیکن نوٹ کریں کہ آیت۔2/البقرۃ:3) کی لغت میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے دوسرے معنی ''بھروسہ کرنا۔ اعتبار کرنا'' بھی ہیں۔ اس معنی میں یہ متعدی ہے اور مَأْمُوْنٌ کا لفظ اسی معنیٰ میں آتا ہے۔ (آیت۔35) جَنّٰتٍ حالت جر میں ہے۔ مُكْرَمُوْنَ اگر جَنّٰتٍ کی صفت ہوتا تو صیغہ مؤنث کا ہوتا اور حالتِ جَرّ میں ہوتا لیکن یہ حالت رفع میں آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اُولٰٓئِكَ کی خبر ہے۔

ترجمہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ	هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾	اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ	جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾
بیشک تمام انسان پیدا کیے گئے	بڑے بے صبرے	جب کبھی چھوتی ہے کسی کو برائی	تو واویلا کرنے والا ہے

وَّ اِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ	مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾	اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ﴿۲۲﴾
اور جب کبھی چھوتی ہے کسی کو بھلائی	تو بہت کنجوسی کرنے والا ہے	سوائے ان نماز پڑھنے والوں کے

الَّذِيْنَ	هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	دَآئِمُوْنَ ﴿۲۳﴾	وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ	حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾
جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی نماز پر	ہمیشہ (متوجہ) رہنے والے ہیں	اور وہ لوگ جن کے مالوں میں	ایک معلوم (مقرر کردہ) حق ہے

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾	وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ	بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۲۶﴾
مانگنے والے اور محروم کے لیے	اور وہ لوگ جو تصدیق کرتے ہیں	بدلے کے دن کی

وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ	مُّشْفِقُوْنَ ﴿۲۷﴾	اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ
اور وہ جو ہیں کہ وہ اپنے رب کے عذاب سے	ڈرنے والے ہیں	بیشک ان کے رب کا عذاب

غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ﴿۲۸﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ	حٰفِظُوْنَ ﴿۲۹﴾	اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ
بھروسہ کیا ہوا (کے قابل) نہیں ہے	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی	حفاظت کرنے والے ہیں	سوائے اپنی بیویوں کے

اَوْ مَا مَلَكَتْ	اَيْمَانُهُمْ	فَاِنَّهُمْ	غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ﴿۳۰﴾	فَمَنِ ابْتَغٰى
یا جن کے مالک ہوئے	ان کے داہنے ہاتھ	تو بیشک وہ لوگ	ملامت کیے ہوئے نہیں ہیں	پھر جس نے جستجو کی

وَرَآءَ ذٰلِكَ	فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ﴿۳۱﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ
اس کے علاوہ کی	تو وہ لوگ ہی حد سے بڑھنے والے ہیں	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی امانتوں کی

وَعَهْدِهِمْ	رٰعُوْنَ ﴿۳۲﴾	وَالَّذِيْنَ	هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ	قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾
اور اپنے قول وقرار کی	نگرانی کرنے والے ہیں	اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی گواہیوں پر	ڈٹے رہنے والے ہیں

وَالَّذِيْنَ	هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ	يُحَافِظُوْنَ ﴿۳۴﴾	اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ	مُّكْرَمُوْنَ ﴿۳۵﴾
اور وہ جو ہیں کہ	وہ لوگ اپنی نماز پر	مسلسل پہرہ دیتے ہیں	وہ لوگ باغوں میں	عزت دیئے ہوئے ہوں گے

نوٹ: 1

جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے، اسی کو اللہ تعالیٰ یوں بیان فرماتا ہے کہ انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں بکثرت مواقع پر نوع انسان کی عام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے والے اور راہ راست اختیار کرنے والے لوگوں کو ان سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔ اور یہی مضمون آگے کی آیات میں بھی آرہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں ایسی نہیں ہیں کہ ان کو تبدیل نہ کیا جا سکے۔ بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کی کوشش کرے تو وہ ان کو دور کر سکتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو متضاد داعیات کی کشمکش میں پیدا کر کے اس سے یہ چاہا ہے کہ وہ خدا کے احکام کے مطابق جن کی تعلیم اس کو نبیوں کی ذریعہ سے دی گئی ہے، ان کے اندر توازن اور ہم آہنگی پیدا کرے اور ان کو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور اس کے قوانین کا تابع بنائے۔ اس

امتحان میں کامیابی پر ہی انسان کی تمام اُخری سعادت کا انحصار ہے۔ اختیار کا شرف بھی اس کو اس امتحان کے لیے عطا ہوا ہے۔ یہ امتحان مقصود نہ ہوتا تو انسان کو اختیار کے شرف سے مشرف کرنے کے کوئی معنی نہ ہوتے اور اس کو دوسری مخلوقات پر برتری حاصل کرنے کی بھی کوئی وجہ نہ ہوتی۔ (تدبر قرآن)۔ 6892

نوٹ: 2

زیر مطالعہ آیات ہمہ جہت (Multi Dimentional) ہیں۔ ان کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے لیے آپ کو تفاسیر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ہماری زیادہ تر توجہ آیات کے اس پہلو پر مرتکز رہے گی جس کا تعلق بے صبری کے علاج سے یا جدید اصطلاح میں جذباتی بلوغت کے حصول سے ہے۔ کسی شخص کو اپنے جذبات پر جتنا کنٹرول حاصل ہے، اتنی ہی جذباتی بلوغت اس نے حاصل کر لی ہے اور کوئی شخص جس حد تک اپنے جذبات کے قابو میں ہے، اتنا ہی وہ جذباتی لحاظ سے نابالغ ہے۔ اب نوٹ کریں کہ انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ جسمانی، ذہنی اور جذباتی، تینوں لحاظ سے نابالغ ہوتا ہے۔ پھر جسمانی اور ذہنی بلوغت حاصل کرنے میں جسم کے قدرتی نظام اور انسانی کوشش، دونوں کا عمل دخل ہوتا ہے۔ لیکن جب انسان سوچنے سمجھنے اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت حاصل کر لیتا ہے تو اس کے بعد جذباتی بلوغت حاصل کرنے کا انحصار انسانی کوشش پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جسمانی بلوغت تقریباً ہر شخص کو پندرہ سال کے لگ بھگ حاصل ہو جاتی ہے۔ ذہنی بلوغت کوئی شخص جتنی حاصل کر سکتا ہے، وہ تقریباً چالیس سال کی عمر تک حاصل کر لیتا ہے۔ لیکن جذباتی بلوغت کے لیے نہ تو عمر کی کوئی قید ہے اور نہ ہی یہ ہر شخص کو نصیب ہوتی ہے۔ کچھ لوگ کم عمری میں ہی جذباتی لحاظ سے بالغ ہو جاتے ہیں۔ جبکہ کچھ لوگ اس کے بغیر ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جذباتی بلوغت کا تقریباً کل کا کل انحصار انسان کی اپنی کوشش اور مشق پر ہے۔

اس ضمن میں پہلے یہ سمجھ لیں کہ ''آخروی سعادت'' کے ساتھ ساتھ ہماری اس دنیا کی زندگی میں جذباتی بلوغت کی کیا اہمیت ہے۔ ماہرین نفسیات اب اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ذہانت کے ٹیسٹ (I.Q. Test) میں کسی کا زیادہ نمبر حاصل کر لینا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ ایسا شخص عملی زندگی میں بھی کامیاب رہے گا۔ اس کی وجہ وہ یہ بتاتے ہیں کہ زندگی کی کامیابی میں ذہانت کا حصہ صرف بیس فیصد ہے، جبکہ اسی فیصد انحصار دیگر عوامل پر ہے۔ ان میں سب سے زیادہ اہم عامل کو جذباتی ذہانت (Emotional) کہا گیا ہے۔ (ریڈرز ڈائجسٹ، مئی ۱۹۹۶ء)۔ اس اہمیت کے پیش نظر ہم جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کے طریقے آیات زیر مطالعہ سے سیکھنے کی کوشش کریں گے۔

جذباتی بلوغت حاصل کرنے کے لیے ان آیات میں جن صفات کا ذکر ہے، ان کی ابتداء بھی نماز کے ذکر سے ہوتی ہے اور ان کا اختتام بھی نماز کے ذکر پر ہوا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ ''نماز ہی سے تمام نیکیاں نشوونما بھی پاتی ہیں اور وہی اپنے حصار میں ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔ اگر نماز وجود میں نہ آئے تو دوسری نیکیاں بھی وجود میں نہیں آتیں۔'' (تدبر قرآن، ج ۵، ص ۳۰۰)۔ اس کورس، جینے کا سلیقہ حصہ اول میں نماز میں عمل خود تجویزی (Self Suggestion) کے نظام اور انسانی عمل پر اس کے اثرات کے متعلق جو کچھ آپ نے پڑھا ہے، اسے ذہن میں تازہ کر لیں تو پر آپ اس حقیقت کو قبول کر لیں گے کہ نماز تمام اچھی صلاحیتوں کی نرسری ہے۔ اب غور کریں کہ اس آیت میں پہلی صفت کے طور پر جو نماز کا ذکر آیا ہے، اس میں الفاظ کی بندش بہت معنی خیز ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جذباتی

بلوغت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھنی چاہیے۔ نہ ہی یہ فرمایا کہ جولوگ نماز پڑھتے ہیں وہ اس نقص سے مستثنیٰ ہوجاتے ہیں بلکہ یہ فرمایا ہے کہ اس سے ایسے نمازی مستثنیٰ ہیں جو اپنی نماز پر ''دائم'' ہوتے ہیں۔ ''حضرت عتبہ بن عامرؓ سے نماز میں دائم رہنے کا مطلب پوچھا گیا کہ کیا اس کی مراد یہ ہے کہ جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ نہیں یہ مراد نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ جو اول سے آخر تک اپنی نماز کی طرف متوجہ رہے۔''۔(معارف القرآن)۔

اب دیکھیں ایک نمازی دن میں پانچ مرتبہ اور نماز کی ہر رکعت میں جب یہ کوشش کرتا ہے کہ غیر متعلق خیالات کو ذہن سے نکال کر وہ اپنی توجہ کو نماز پر مرکوز رکھے تو اس مسلسل مشق کی وجہ سے اس کی دو صلاحیتیں اُجاگر ہو کر پختہ ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ذہن میں غیر متعلق یا ناپسندیدہ خیالات کی موجودگی کا احساس ہو جانا۔ دوسرے یہ استعداد حاصل ہو جانا کہ انسان جس خیال کو چاہے ذہن سے جھٹک دے اور جس خیال کو چاہے ذہن میں رہنے دے۔ نماز میں یہ صلاحیتیں حاصل کر لینے کے بعد زندگی کے معاملات میں انہیں استعمال کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ اب یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کی یہ شاہ کلید (Master Key) ہے، کیونکہ جیسے خیالات انسان کے ذہن میں ہوتے ہیں ویسے ہی جذبات اس کے اندر پروان چڑھتے ہیں۔

اس ضمن میں دوسری صفت یہ بیان ہوئی کہ سائل اور محروم کا حق ادا کرتے ہیں۔ اب نوٹ کریں کہ رزق کی مختلف اقسام میں سب سے قوی محبت مال کی محبت ہے۔ انفاق سے اس جذبہ کو کنٹرول کرنے کی مشق ہوتی ہے۔ اس پر کنٹرول حاصل کرنے کے بعد زندگی کے معاملات میں دیگر محبتوں اور رغبتوں پر کنٹرول حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

خیالات اور جذبات پر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے جو طریقۂ کار اب تک سامنے آیا ہے اس پر عمل کرتے ہوئے ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کن خیالات کو غلط سمجھ کر ذہن سے نکالا جائے اور کن کو پروان چڑھایا جائے۔ اس سلسلہ میں درست فیصلہ کرنے میں، اصولی طور پر تو انسان کو کوئی مشکل پیش نہیں آنی چاہیے کیونکہ نیکی اور بدی کا شعور انسان کی فطرت میں ودیعت کر کے اسے دنیا کی امتحان گاہ میں بھیجا جاتا ہے۔ (سورۃ الشّمس۔8) لیکن یہاں آ کر اس کی فطرت پر خواہشات اور مفادات کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان بدلے کے دن یعنی آخرت کے حساب کتاب کے یقین اور اللہ کے عذاب کے خوف کے ساتھ غور و فکر کرے تو پھر یہ پردے ہٹ جائیں گے اور اس کی فطرت اس کی رہنمائی کرے گی۔ پھر اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ کون سے خیالات اور جذبات پسندیدہ ہیں اور کون سے ناپسندیدہ ہیں۔

اس کے بعد بتایا گیا کہ بے صبری کی کمزوری سے مستثنیٰ لوگوں کی ایک صفت یہ بھی ہوتی ہے کہ جنس کے معاملہ میں وہ آیا نظم وضبط (Sex Discipline) کے پابند ہوتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام انسانی جذبوں میں جنس کا جذبہ سب سے زیادہ پرکشش ہے۔ اس لیے جو شخص اس کو کنٹرول کر لے اس کے لیے باقی جذبوں کو کنٹرول کرنا کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔ چنانچہ اس ضمن میں سب سے زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ جب بھی ذہن میں کوئی ایسا خیال آئے جو ایسے جنسی جذبے کو بیدار کرے جس کی اجازت نہیں ہے، تو اسے لازماً ذہن سے جھٹک کر ذہن کو دوسرے خیالات میں مصروف کرنے کی کوشش کرے۔ اس کوشش میں کامیابی کی استعداد حاصل کیے بغیر جنسی نظم وضبط کی پابندی کرنا بہت مشکل ہے۔

اس کے بعد اگلی صفت یہ بیان ہوئی کہ بے صبری سے مستثنیٰ لوگ اپنی امانتوں اور عہد کا پاس کرتے ہیں۔ اس میں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ واحد لفظ امانت کے بجائے اس کی جمع امانات استعمال کی گئی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امانت کی مختلف اقسام ہیں اور یہ لوگ ہر قسم کی امانت کا پاس کرتے ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے ہمیں حواسِ خمسہ، عقل اور تفقہ کی جو صلاحیتیں دی ہیں، وہ سب امانت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جب واپس مانگتا ہے تو دینا پڑتا ہے۔ اس لیے واپس نہ کرنے والی خیانت کی تو ہمیں قدرت ہی نہیں ہے۔ البتہ انہیں استعمال کرنے کی اجازت کچھ حدود و قیود کے ساتھ ملی ہے۔ جس نے ان کا لحاظ رکھتے ہوئے انہیں استعمال کیا اس نے امانت کا حق ادا کر دیا۔ جس نے ان کا لحاظ نہیں رکھا اس نے خیانت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں وارننگ دے دی ہے کہ ان سب صلاحیتوں (کے استعمال) کے متعلق ہم سے پوچھا جائے گا۔

(سورۂ بنی اسرائیل۔:36)۔ اس کے علاوہ ہمارے تمام مال و اسباب بھی اس پہلو سے امانت ہیں کہ انہیں حاصل کرنے کی بھی اور انہیں استعمال کرنے کی اجازت بھی حدود و قیود کے ساتھ ملی ہے۔ ان کے متعلق بھی قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ (سورۂ التکاثر۔8) اب یہ بات بہت واضح ہے کہ جذبات پر کنٹرل حاصل کیے بغیر ان امانتوں کا حق ادا کرنا ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح عہد و پیمان میں وہ سارے معاہدے شامل ہیں جو انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان، انسان اور انسان کے درمیان یا قوم اور قوم کی درمیان استوار کیے گئے ہوں۔ معاہدے تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی، لیکن بہت سے معاہدے صرف Implied ہوتے ہیں جیسے والدین اور اولاد، استاد اور شاگرد وغیرہ کے حقوق و فرائض۔ اسی طرح اگلی آیت میں شہادت (گواہی) کے بجائے جمع کا صیغہ شہادات استعمال ہوا ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ شہادت کی بہت سی قسمیں ہیں اور ہر قسم کی شہادت کو قائم رکھنا واجب ہے۔ اس میں توحید و رسالت کی گواہی (کلمۂ شہادت) بھی شامل ہے، حدودِ شرعیہ کی شہادت بھی اور لوگوں کے باہمی معاملات جو کسی کے سامنے ہوئے ہوں، ان کی شہادت بھی۔ ان شہادتوں کو چھپانا اور ان میں کمی بیشی کرنا حرام ہے۔ ان کو صحیح صحیح قائم رکھنا اس آیت کی رو سے فرض ہے۔ (معارف القران)۔

رسول اللہ ﷺ نے مختلف پیرائے میں ہم کو جذباتی بلوغت حاصل کرنے کی تلقین کی ہے' ہم صرف دو ارشادات نقل کر رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم لوگ اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع بنا کر مت رکھو۔ یہ کہنا غلط ہے۔ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم لوگ اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم لوگ نیکی کرو اور اگر لوگ بدسلوکی کریں تو تم لوگ ظلم نہ کرو۔ (تفہیم القرآن۔ ج2، ص456) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو React کرنے سے منع کیا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ان میں سے چار باتیں آپ ﷺ نے یہ فرمائیں کہ میں خواہ کسی سے خوش ہوں یا ناراض، ہر حالت میں انصاف کی بات کہوں۔ جو میرا حق مارے میں اس کا حق ادا کروں۔ جو مجھے محروم کرے میں اسے عطا کروں۔ اور جو مجھ پر ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں۔ ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو تجھ سے خیانت کرے، تو اس سے خیانت نہ کر۔ (تفہیم القرآن۔ ج2، ص456)۔ ایک طرف یہ اسی ہدایت کی تشریح ہے کہ تم لوگ اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع مت بناؤ۔ دوسری طرف یہ ایک بالغ شخصیت کا کردار ہے جس کا کامل نمونہ نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس ہے۔

بات ختم کرنے سے پہلے ذہن میں یہ حقیقت واضح کر لیں کہ جسمانی اور ذہنی بلوغت سے شخصیت (Personality) بالغ نہیں ہوتی۔ بالغ شخصیت (Matured Personality) کے لیے جذباتی بلوغت ضروری ہے۔ (جینے کا سلیقہ حصہ چہارم صفحات 25 تا 37 سے ماخوذ)۔

1892

آیت نمبر (36 تا 44)

ع ز و

(ن) عَزْوًا منسوب ہونا۔ اپنے آپ کو دوسرے کی طرف منسوب کرنا۔ خواہ یہ سچ ہو یا جھوٹ۔

عِزَۃٌ (یہ دراصل عِزْوٌ تھا۔ اس کی واؤ گری ہوئی ہے۔ قاعدہ یہ ہے کہ لام کلمہ کا حرف علت کسی وجہ سے گراتے ہیں تو اس کی جگہ گول تا لگا دیتے ہیں۔ اس طرح یہ عِزَۃٌ استعمال ہوتا ہے۔ اس کی جمع عِزُوْن۔ عِزِیْن، آتی ہے)۔ اس کے معنی ہیں گروہ یا جماعت۔ لیکن یہ ایسی جماعت کے لیے آتا ہے جس کے افراد بلحاظ نسبت یا بلحاظ مدد و تعاون ایک دوسرے کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ زیر مطالعہ آیت۔ 37

و ف ض

X X ثلاثی مجرد سے فعل نہیں آتا۔

(افعال) اِیْفَاضًا تیز چلنا، دوڑنا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 44۔

ترکیب

(آیت۔ 36) فَمَالِ میں جو لام ہے یہ حروف جارّہ والا لام ہے اور اس کا تعلق فَمَا سے نہیں ہے بلکہ اَلَّذِیْنَ سے ہے۔ اصل عبارت یوں ہے۔ فَمَا لِلَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ چونکہ حرف جار لِ الگ لکھا گیا ہے اس لیے اَلَّذِیْنَ کا ہمزہ الوصل واپس آ گیا ہے۔ اس آیت میں اس کو اس طرح لکھنا قرآن مجید کا مخصوص املا ہے۔ مُھْطِعِیْنَ اسم الفاعل ہے اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔ 42)۔ فَذَرْھُمْ میں ذَرْ فعل امر ہے۔ اس کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یَخُوْضُوْا اور یَلْعَبُوْا مضارع مجزوم ہیں، جبکہ حَتّٰی کی وجہ سے یُلٰقُوْا مضارع منصوب ہے۔ (آیت۔ 44) خَاشِعَۃً اسم الفاعل ہے اور حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔

ترجمہ

عَنِ الْيَمِيْنِ	مُهْطِعِيْنَ ﴿٣٦﴾	قِبَلَكَ	لِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا	فَمَا
دائیں سے	لپکنے (چڑھائی کرنے) والے ہوتے ہوئے	(آتے ہیں) آپ کی طرف	ان کے لیے جنہوں نے انکار کیا	تو کیا ہے

اَنْ يُّدْخَلَ	كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	اَيَطْمَعُ	عِزِيْنَ ﴿٣٧﴾	وَعَنِ الشِّمَالِ
کہ وہ داخل کیا جائے گا	ہر ایک شخص ان میں سے	کیا امید رکھتا ہے	گروہ در گروہ ہوتے ہوئے	اور بائیں سے

فَلَآ	مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿٣٩﴾	اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ	كَلَّا ط	جَنَّةَ نَعِيْمٍ ﴿٣٨﴾
پس نہیں!	اس سے جسے یہ لوگ جانتے ہیں	بیشک ہم نے پیدا کیا ان کو	ہرگز نہیں	سدا بہاری کے باغ میں

عَلٰٓى اَنْ نُّبَدِّلَ	اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿٤٠﴾	بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ	اُقْسِمُ
اس پر کہ ہم تبدیل کر دیں (ان کو)	بیشک ہم یقیناً قدرت رکھنے والے ہیں	مشرقوں اور مغربوں کے رب کی	میں قسم کھاتا ہوں

يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا	فَذَرْهُمْ	وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ﴿٤١﴾	خَيْرًا مِّنْهُمْ
وہ بے پر کی اڑائیں اور کھیلیں کو دیں	تو آپ چھوڑ دیں ان کو	اور ہم عاجز کیے ہوئے نہیں ہیں	ان سے بہتر سے

حَتّٰى يُلٰقُوْا	يَوْمَهُمُ الَّذِىْ	يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۲﴾
یہاں تک کہ وہ ملاقات کریں	اپنے اس دن سے جس کا	ان سے وعدہ کیا جاتا ہے

يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ	مِنَ الْاَجْدَاثِ	سِرَاعًا	كَاَنَّهُمْ اِلٰى نُصُبٍ
جس دن وہ لوگ نکلیں گے	قبروں سے	ایک دوسرے پر جلدی کرتے ہوئے	جیسے کہ وہ لوگ کسی استھان کی طرف

يُّوْفِضُوْنَ ﴿۴۳﴾	خَاشِعَةً	اَبْصَارُهُمْ	تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ
بھاگتے ہوں گے	جھکنے والی ہوں گی	ان کی آنکھیں	چھا جائے گی ان پر ذلت

ذٰلِكَ الْيَوْمُ	الَّذِىْ	كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۴۴﴾
یہ دن	وہ ہے جس کا	ان سے وعدہ کیا جاتا تھا

نوٹ:1

سابقہ آیات۔19 تا35۔ میں یہ بتایا گیا ہے کہ کس قسم کے لوگوں کو جنت میں جگہ ملے گی۔قرآن کا یہ فیصلہ سن کر قریش کے مغروروں کے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔وہ یہ کس طرح سن سکتے تھے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے مفلوک الحال ساتھی تو جنت میں براجمان ہوں گے اور تمام عزتوں اور عظمتوں کے وارث، ساداتِ قریش دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔اس غصہ میں وہ ٹولیاں بنا بنا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تردید توہین کے لیے دائیں بائیں سے آپؐ پل پڑتے۔زیر مطالعہ آیات میں اسی صورتِ حال کی تصویر اور ان مغروروں کی خود باختگی پر اظہار تعجب ہے۔ (تدبر قرآن)۔

آیت۔38۔کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی جنت تو ان لوگوں کے لیے ہے جن کی صفات ابھی ابھی بیان کی جا چکی ہیں۔اب کیا یہ لوگ جو حق بات سننا تک گوارہ نہیں کرتے اور حق کی آواز کو دبانے کے لیے دوڑے چلے آ رہے ہیں، جنت کے امیدوار ہو سکتے ہیں؟ کیا خدا نے اپنی جنت ایسے ہی لوگوں کے لیے بنائی ہے؟ اس مقام پر سورۃ القلم کی آیات۔34 تا41 پیش نظر رکھنی چاہئیں جن میں کفار مکہ کو اُن کی اِس بات کا جواب دیا گیا ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔39۔کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔مضمونِ سابق کے ساتھ اس کا تعلق مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جس مادے سے یہ لوگ بنے ہیں اس کے لحاظ سے تو سب انسان یکساں ہیں۔اگر وہ مادہ ہی انسان کے جنت میں جانے کا سبب ہو تو نیک و بد، ظالم و عادل، مجرم اور بے گناہ، سب ہی کو جنت میں جانا چاہیے۔لیکن معمولی عقل ہی یہ فیصلہ کرنے کے لیے کافی ہے کہ جنت کا استحقاق انسان کے مادۂ تخلیق کی بنا پر نہیں بلکہ اس کے اوصاف کے لحاظ سے ہونا چاہیے۔اور اگر اس فقرے کو بعد کے مضمون کی تمہید سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو ہمارے عذاب سے محفوظ سمجھ رہے ہیں۔حالانکہ ہم ان کو دنیا میں بھی جب چاہیں عذاب دے سکتے ہیں اور موت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے بھی جب چاہیں اٹھا سکتے ہیں۔یہ خود جانتے ہیں کہ نطفہ کی ایک حقیر سی بوند سے ان کی تخلیق کی ابتداء کر کے ہم نے ان کو چلتا پھرتا انسان بنایا ہے۔ اگر اپنی اس تخلیق پر یہ غور کرتے تو انہیں کبھی یہ غلط فہمی لاحق نہ ہوتی کہ ہم انہیں دوبارہ پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔40۔ میں اللہ تعالیٰ نے خود اپنی ذات کی قسم کھائی ہے۔مشرقوں اور مغربوں کا لفظ اس بنا پر استعمال کیا گیا ہے کہ سال کے دوران میں سورج ہر روز ایک نئے زاویہ پر غروب ہوتا ہے۔نیز زمین کے مختلف حصوں پر سورج الگ الگ اوقات میں پے در پے طلوع اور غروب ہوتا چلا جاتا ہے۔ان اعتبارات سے مشرق اور مغرب ایک نہیں ہیں بلکہ بہت سے ہیں۔ایک دوسرے اعتبار سے شمال اور جنوب کے مقابلے میں ایک جنوب مشرق ہے اور دوسری جہت مغرب ہے۔اس بنا پر سورۃ شعراء کی آیت۔28 اور سورہ مزمل کی آیت۔19 میں رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ایک اور لحاظ سے زمین کے دو مشرق اور دو مغرب ہیں کیونکہ جب زمین کے ایک نصف کرے پر سورج غروب ہوتا ہے تو دوسرے پر طلوع ہوتا ہے۔اس بنا پر سورۂ رحمن کی آیت۔17 رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ﴿۱۷﴾ کے الفاظ استعمال فرمائے گئے ہیں۔ (تفہیم القرآن)۔

6892

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

6940

سورۃ نوح (71)

آیت نمبر (1 تا 14)

ترکیب

(آیت۔3۔4) اُعۡبُدُوۡا، اِتَّقُوۡا، اَطِیۡعُوۡا، فعل امر ہیں۔ ان کا جواب امر ہونے کی وجہ سے یَغۡفِرۡ اور یُؤَخِّرۡ مجزوم ہوئے ہیں۔ (آیت۔5) لَیۡلاً اور نَہَارًا ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔6) لَمۡ یَزِدۡ کا فاعل دُعَآءِیۡ ہے اور اس کا مفعول ھُمۡ کی ضمیر ہے۔ جبکہ فِرَارًا کی نصب تمیز ہونے کی وجہ سے ہے۔ (آیت۔7) کُلَّمَا شرط ہے اس لیے اس کے آگے آنے والے افعال ماضی کا ترجمہ حال میں ہوگا۔ اِسۡتِکۡبَارًا کی نصب مفعول مطلق ہونے کی وجہ سے ہے۔ (آیت۔8) جِہَارًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ (آیت۔9) اِسۡرَارًا مفعول مطلق ہے۔ (آیت۔10) کَانَ کی خبر ہونے کی وجہ سے غَفَّارًا حالتِ نصب میں ہے۔ کَانَ کا ترجمہ حال میں ہوگا کیونکہ یہ آفاقی صداقت کا بیان ہے (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:49، نوٹ۔2) (آیت۔11) یُرۡسِلِ میں لام کی کسرہ بتا رہی ہے کہ یہ مضارع مجزوم ہے اور سابقہ آیت میں فعل امر اِسۡتَغۡفِرُوۡا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہوا ہے۔ اس کا مفعول اَلسَّمَآءَ ہے اور مِدۡرَارًا حال ہے۔ (آیت۔12) یُمۡدِدۡ اور یَجۡعَلۡ بھی سابقہ فعل امر اِسۡتَغۡفِرُوۡا کا جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہیں۔ جبکہ جَنّٰتٍ اور اَنۡہٰرًا مفعول ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔13) تَرۡجُوۡنَ کا مفعول وَقَارًا ہے۔ (آیت۔14) اَطۡوَارًا حال ہے۔

ترجمہ

اِنَّاۤ اَرۡسَلۡنَا	نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖۤ	اَنۡ اَنۡذِرۡ قَوۡمَکَ	مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَہُمۡ
بیشک ہم نے بھیجا	نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف	کہ آپؑ خبردار کریں اپنی قوم کو	اس سے پہلے کہ پہنچے ان کے پاس

عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ①	قَالَ یٰقَوۡمِ	اِنِّیۡ لَکُمۡ	نَذِیۡرٌ مُّبِیۡنٌ ②	اَنِ اعۡبُدُوا اللّٰہَ
ایک دردناک عذاب	انہوںؑ نے کہا اے میری قوم	بیشک میں تمہارے لیے	ایک واضح خبردار کرنے والا ہوں	کہ تم لوگ بندگی کرو اللہ کی

وَاتَّقُوۡہُ	وَاَطِیۡعُوۡنِ ③	یَغۡفِرۡ لَکُمۡ
اور تقویٰ اختیار کرو اس کا	اور اطاعت کرو میری	تو وہ بخش دے گا تمہارے لیے

مِّنۡ ذُنُوۡبِکُمۡ	وَیُؤَخِّرۡکُمۡ	اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ؕ
تمہارے گناہوں میں سے	اور وہ پیچھے کرے گا (مہلت دے گا) تم کو	ایک مقررہ مدت تک

اِنَّ اَجَلَ اللّٰہِ	اِذَا جَآءَ	لَا یُؤَخَّرُ ۘ	لَوۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ④	قَالَ رَبِّ
بیشک اللہ کا (مقرر کردہ) وقت	جب آ جائے	تو وہ مؤخر نہیں کیا جاتا	کاش تم لوگ جانتے	انہوںؑ نے کہا اے میرے رب

اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ	لَیۡلًا وَّنَہَارًا ⑤	فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ	دُعَآءِیۡۤ	اِلَّا فِرَارًا ⑥
بیشک میں نے بلایا اپنی قوم کو	رات میں اور دن میں	تو زیادہ نہیں کیا ان کو	میرے بلانے نے	سوائے بھاگنے کے

وَاِنِّیۡ کُلَّمَا	دَعَوۡتُہُمۡ	لِتَغۡفِرَ لَہُمۡ	جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَہُمۡ
اور بیشک میں نے جب بھی	بلایا ان کو	تاکہ تو بخش دے ان کے لیے (ان کے گناہ)	تو وہ رکھ لیتے ہیں اپنی انگلیاں

فِيْٓ اٰذَانِهِمْ	وَاسْتَغْشَوْا	ثِيَابَهُمْ	وَاَصَرُّوْا
اپنے کانوں میں	اور خود کو ڈھانپتے ہیں	اپنے کپڑوں سے	اور اڑ جاتے ہیں

وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۚ﴿۷﴾	ثُمَّ اِنِّيْ دَعَوْتُهُمْ	جِهَارًا ۙ﴿۸﴾
اور بڑائی چاہتے ہیں جیسے بڑائی کا حق ہے	پھر بیشک میں نے بلایا ان کو	آواز بلند کرتے ہوئے

ثُمَّ اِنِّيْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ	وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ	اِسْرَارًا ۙ﴿۹﴾	فَقُلْتُ
پھر بیشک میں نے اعلان کیا ان کے لیے	اور میں نے چپکے سے کہا ان سے	جیسے چپکے سے کہتے ہیں	تو میں نے کہا

اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ	اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۙ﴿۱۰﴾	يُّرْسِلِ
تم لوگ مغفرت مانگو اپنے رب سے	بیشک وہ بہت بخشنے والا ہے	(مغفرت مانگو گے) تو وہ بھیجے گا

السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ	مِّدْرَارًا ۙ﴿۱۱﴾	وَّيُمْدِدْكُمْ	بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ
آسمان کو تم لوگوں پر	لگاتار برسنے والا ہوتے ہوئے	اور وہ اعانت کرے گا تمہاری	اموال (معیشت) سے اور بیٹوں (افرادی قوت) سے

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ	وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ؕ﴿۱۲﴾	مَا لَكُمْ
اور وہ بنائے گا تمہارے لیے کچھ باغات	اور بنائے گا تمہارے لیے کچھ نہریں	تم لوگوں کو کیا ہوا ہے

لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ	وَقَارًا ۚ﴿۱۳﴾	وَقَدْ خَلَقَكُمْ	اَطْوَارًا ﴿۱۴﴾
(کہ) تم لوگ امید نہیں رکھتے اللہ سے	کسی عظمت کی	حالانکہ اس نے پیدا کیا ہے تم لوگوں کو	مختلف حالتوں پر ہوتے ہوئے

نوٹ:1

سابقہ سورہ۔ المعارج۔ میں عآب کے لیے جلدی مچانے والوں کو جواب اور پیغمبر ﷺ کو صبر و انتظار کی تلقین ہے۔ اس سورہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کے مراحل، ان کے طویل صبر و انتظار اور بالآخر ان کی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے کی سرگزشت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہے اور اس سے مقصود آنحضرت ﷺ اور آپؐ کی قوم کے سامنے ایک ایسا آئینہ رکھ دینا ہے جس میں آپؐ بھی دیکھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو اپنی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے صبر و انتظار کے کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، ساتھ ہی آپؐ کی قوم بھی دیکھ لے کہ اللہ تعالیٰ جلد بازوں کو ان کی جلد بازی اور طنز و طعن کے باوجود ڈھیل دیتا ہے لیکن بالآخر پکڑتا ہے اور جب پکڑتا ہے تو کوئی چھڑانے والا نہیں ہوتا۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔4۔ میں حضرت نوحؑ کی دعوت کے تین بنیادی ارکان بیان ہوتے ہیں، توحید، شریعت الٰہی کی پابندی اور رسول کی اطاعت۔ انہی تین ارکان پر تمام رسولوں کی دعوت مبنی رہی ہے۔ اس حوالہ سے آگے آیت۔4۔ میں فرمایا کہ اگر تم نے میری یہ تینوں باتیں مان لیں تو اللہ تعالیٰ تمہارے ان جرائم کو معاف کر دے گا جن کے سبب سے تم عذاب کے مستحق قرار پائے ہو اور ایک معین مدت تک کے لیے تم کو اس دنیا میں رہنے بسنے کی مہلت مل جائے گی۔ یہاں لفظ مِنْ اپنے معروف معنی یعنی تبعیض ہی کے لیے آیا ہے پوری بات گویا یوں ہے کہ اگر تم میری باتیں مان لوگے تو اللہ تمہارے وہ سارے گناہ معاف کر دے گا جو اب تک تم سے صادر ہوئے ہیں، یہ بات معلوم بھی ہے اور معقول بھی کہ کفر کے بعد ایمان کی زندگی اختیار کرنے سے آدمی کے وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں جو کفر کی زندگی میں اس سے صادر ہوئے ہوتے ہیں۔ رہے وہ گناہ جن کا ارتکاب آدمی ایمان کی زندگی اختیار کرنے کے بعد کرتا ہے، تو ان کے معاف ہونے کے لیے ایک ضابطہ ہے جو سورۂ نساء کی آیت۔17۔ میں بیان ہوا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے ”کچھ نہیں سوائے اس کے کہ توبہ (قبول کرنا) اللہ پر ان لوگوں کے لیے ہے جو برا کام

کرتے ہیں نادانی میں پھر جلدی ہی توبہ کر لیتے ہیں۔تو یہ لوگ ہیں اللہ جن کی توبہ قبول کرتا ہے۔اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔'' اس آیت میں لفظ مِنْ اسی حقیقت کے اظہار کے لیے آیا ہے۔اگر یہ مِنْ یہاں نہ ہوتا تو آیت کے یہ معنی بھی نکل سکتے تھے کہ تمہارے تمام اگلے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔حالانکہ یہ بات صحیح نہیں ہے۔کیونکہ کفر کے بعد ایمان صرف پچھلے گناہوں کو گرانے والا بنتا ہے، آگے کے گناہوں کا گرانے والا نہیں بنتا۔(تدبر قرآن)۔

حرف مِنْ اکثر تبعیض کے لیے آتا ہے۔اگر یہ معنی لیے جائیں تو مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے سے تمہارے وہ گناہ معاف ہو جائیں گے جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔کیونکہ حقوق العباد کی معافی کے لیے ایمان لانے کے بعد بھی یہ شرط ہے کہ جو حقوق ادائیگی کے قابل ہیں ان کو ادا کرے، جیسے مالی واجبات وغیرہ اور جو قابل ادائیگی نہیں، جیسے زبان یا ہاتھ سے کسی کو ایذا پہنچانا، تو ان کو معاف کرائے۔حدیث میں جو یہ آیا ہے کہ ایمان لانے سے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس میں بھی حقوق العباد کی ادائیگی یا معافی شرط ہے۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:3

وَيُؤَخِّرْكُمْ اِلٰى اَجَلٍ مُّسَمًّى کا مطلب یہ ہے کہ تم ایمان لے آئے تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس مدت تک دنیا میں مہلت دے گا جو تمہارے لیے مقرر ہے۔اس کا حاصل یہ ہوا کہ اگر ایمان نہ لائے تو یہ بھی ممکن ہے کہ مدت مقررہ سے پہلے ہی تم پر عذاب لا کر ہلاک کر دے۔ معلوم ہوا کہ عمر کی مدت مقررہ میں بعض اوقات کوئی شرط ہوتی ہے کہ اس نے فلاں کام کر لیا تو اس کی عمر اتنی ہوگی اور نہ کیا تو اتنی کم کر دی جائے گی۔اللہ کی ناشکری سے عمر گھٹ جانا اور شکر گزاری سے عمر بڑھ جانا، اسی طرح بعض اعمال مثلاً والدین کی اطاعت وخدمت سے عمر میں ترقی ہونا جو احادیث سے ثابت ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قضائے الٰہی کو کوئی چیز بجز دعا کے نہیں روک سکتی اور کسی کی عمر میں زیادتی بجز بر والدین کے نہیں ہو سکتی۔بر کے معنی ان کے ساتھ اچھا سلوک ہے اور اس حدیث کا مطلب یہی ہے کہ تقدیر معلق میں ان اعمال کی وجہ سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔

اس کی تشریح تفسیر مظہری میں یہ ہے کہ تقدیر اور قضائے الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک مُبرم یعنی قطعی اور دوسری معلق یعنی جو کسی شرط پر معلق ہو۔قرآن کریم میں ان دونوں قسم کی قضا و تقدیر کا ذکر سورۃ الرعد کی آیت۔39۔میں ہے کہ اللہ تعالیٰ لوحِ محفوظ میں ترمیم وتبدیل کرتا رہتا ہے اور اللہ کے پاس اصل کتاب ہے۔اس سے مراد وہ کتاب ہے جس میں تقدیر مبرم لکھی ہوئی ہے۔(معارف القرآن)

نوٹ:4

آیت۔10 تا12۔میں جو بات کہی گئی ہے کہ اللہ سے مغفرت کے طلبگار بنو تو اللہ تعالیٰ تمہیں معیشت اور افرادی قوت کی فراوانی عطا فرمائے گا، یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مختلف پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔مثلاً المائدہ۔66، الاعراف۔96، ھود۔3۔52، طٰہٰ۔124۔ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خدا سے بغاوت کی روش صرف آخرت میں ہی نہیں، دنیا میں بھی انسان کی زندگی تنگ کر دیتی ہے۔اس کے برعکس اگر کوئی قوم ایمان وتقویٰ اور احکام الٰہی کی اطاعت کا طریقہ اختیار کر لے تو یہ آخرت ہی میں نافع نہیں بلکہ دنیا میں بھی اس پر نعمتوں کی بارش ہونے لگتی ہے۔قرآن مجید کی اسی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ایک مرتبہ قحط کے موقع پر حضرت عمرؓ بارش کی دعا کرنے کے لیے نکلے اور صرف استغفار پر اکتفا فرمایا۔لوگوں نے کہا کہ آپ نے بارش کے لیے تو دعا کی ہی نہیں۔آپؓ نے فرمایا کہ میں نے آسمان کے ان دروازوں کو کھٹکھٹا دیا ہے جہاں سے بارش نازل ہوتی ہے اور پھر سورۂ نوحؑ کی یہ آیات پڑھ کر لوگوں کو سنا دیں۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 5

آیت۔13۔14 کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی بڑائی سے امید رکھنا چاہیے کہ اس کی فرمانبرداری کرو گے تو تم کو عزت و وقار عنایت فرمائے گا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی بڑائی کا اعتقاد کیوں نہیں رکھتے اور اس کی عظمت وجلال سے ڈرتے کیوں نہیں۔ (حالانکہ تمہارا اپنا وجود اس کی عظمت کی علامت کے طور پر کافی ہے)۔ ماں کے پیٹ میں تم نے طرح طرح کے رنگ بدلے۔ اور اصلی مادے سے لے کر موت تک آدمی کتنی پلٹیاں کھاتا ہے، کتنے اطوار وادوار اور اتار چڑھاؤ سے گزرتا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

آیت نمبر (15 تا 28)

ترکیب

(آیت۔16) فَعَلَ کے دو مفعول آتے ہیں۔ اس لحاظ سے نُوْرًا اور سِرَاجًا کو اس کا مفعول ثانی بھی مانا جاسکتا ہے اور علی الترتیب اَلْقَمَرَ اور الشَّمْسَ کا حال بھی مانا جاسکتا ہے۔ دونوں ترجمے درست مانے جائیں گے۔ ہم انہیں حال ماننے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔17) اَنْبَتَ باب افعال ہے۔ اس کا مصدر اِنْبَاتًا ہے، لیکن یہاں مفعول مطلق کے طور پر اِنْبَاتًا کے بجائے ثلاثی مجرد کا مصدر نَبَاتًا آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابواب مزید فیہ کے افعال کا مفعول مطلق اُسی باب کے مصدر سے بھی آسکتا ہے اور ثلاثی مجرد کے مصدر سے بھی۔ (آیت۔19) یہاں بھی ہم بِسَاطًا کو جَعَلَ کا مفعول ثانی ماننے کے بجائے اسے اَلْاَرْضَ کا حال ماننے کو ترجیح دیں گے۔ (آیت۔21) لَمْ یَزِدْهُ کی ضمیر ہٗ دراصل مَنْ کی ضمیر عائد ہے۔ مَالُهٗ اور وَلَدُهٗ لَمْ یَزِدْ کے فاعل ہیں جبکہ خَسَارًا تمیز ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے، یہ بات ہم پڑھ چکے ہیں کہ مَنْ کا لفظ اصلاً واحد ہے لیکن یہ واحد، تثنیہ، جمع، مذکر مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔ اس آیت میں مَنْ جمع کے معنی میں ہے، البتہ لفظی رعایت کے تحت مَالُهٗ اور وَلَدُهٗ کے ساتھ واحد ضمیریں آئی ہیں، جبکہ معنوی رعایت کے تحت آگے کی آیات میں مَكَرُوْا۔ قَالُوْا۔ قَدْ اَضَلُّوْا، سب جمع کے صیغے آئے ہیں۔ ان میں شامل هُمْ کی فاعلی ضمیریں اسی مَنْ کے لیے ہیں۔ کیونکہ نوحؑ کی قوم نے انؑ کی نافرمانی کرنے میں کسی ایک شخص کی نہیں بلکہ قوم کے سرداروں کی پیروی کی تھی۔ (آیت۔26) دَیَّارٌ کا لفظ فَعَّالٌ کے وزن پر نہیں ہے۔ کیونکہ اس وزن پر لفظ دَوَّارٌ بنے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ دراصل فَیْعَالٌ کے وزن پر ہے۔ اس وزن پر اصلی شکل دَیْوَارٌ بنتی ہے۔ پھر واؤ، یا میں تبدیل ہو کر سابقہ یا میں مدغم ہوتی ہے تو دَیَّارٌ استعمال ہوتا ہے۔

ترجمہ

اَلَمْ تَرَوْا	كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ	سَبْعَ سَمٰوٰتٍ	طِبَاقًا ﴿١٥﴾	وَّجَعَلَ الْقَمَرَ
کیا تم لوگوں نے غور ہی نہیں کیا	کیسے پیدا کیا اللہ نے	سات آسمانوں کو	تہہ در تہہ ہوتے ہوئے	اور اس نے بنایا چاند کو

فِيْهِنَّ نُوْرًا	وَّجَعَلَ الشَّمْسَ	سِرَاجًا ﴿١٦﴾
ان (آسمانوں) میں ایک نور ہوتے ہوئے	اور اس نے بنایا سورج کو	ایک چراغ ہوتے ہوئے

وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ	مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ﴿١٧﴾	ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ	فِيْهَا
اور اللہ نے اگایا تم لوگوں کو	زمین سے جیسے اگانے کا حق ہے	پھر وہ واپس لے جائے گا تم لوگوں کو	اس (زمین) میں

وَيُخْرِجُكُمْ	اِخْرَاجًا ﴿١٨﴾	وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ
اور وہ نکالے گا تم کو	جیسے نکالنے کا حق ہے	اور اللہ نے بنایا تمہارے لیے زمین کو

بِسَاطًا ﴿١٩﴾	لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا	سُبُلًا فِجَاجًا ﴿٢٠﴾ ع	قَالَ نُوْحٌ رَّبِّ
ایک بچھونا ہوتے ہوئے	تا کہ تم لوگ چلو اس (زمین) میں سے	کشادہ راستوں پر	کہا نوحؑ نے اے میرے رب

اِنَّهُمْ عَصَوْنِيْ	وَاتَّبَعُوْا مَنْ	لَّمْ يَزِدْهُ	مَالُهٗ وَوَلَدُهٗٓ
بیشک ان لوگوں نے نافرمانی کی میری	اور پیروی کی اُن (سرداروں) کی	زیادہ نہیں کیا جن کو	ان کے مال اور ان کی اولاد نے

اِلَّا خَسَارًا ﴿٢١﴾ ج	وَمَكَرُوْا	مَكْرًا كُبَّارًا ﴿٢٢﴾ ج
مگر بلحاظ خسارے کے	اور ان لوگوں (سرداروں) نے چال چلی	جیسے کوئی زبردست چال چلنے کا حق ہے

وَقَالُوْا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ	وَلَا تَذَرُنَّ	وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا ۙ وَّلَا يَغُوْثَ
اور انہوں نے کہا تم لوگ ہرگز مت چھوڑنا اپنے خداؤں کو	اور تم لوگ ہرگز مت چھوڑنا	ودّ کو اور نہ سواع کو اور نہ یغوث کو

وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ﴿٢٣﴾ ج	وَقَدْ اَضَلُّوْا	كَثِيْرًا ۚ
اور (نہ ہی) یعوق اور نسر کو	اور انہوں (سرداروں) نے گمراہ کیا ہے	بہتوں کو

وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ	اِلَّا ضَلٰلًا ﴿٢٤﴾	مِمَّا
اور تو زیادہ مت کر ظلم کرنے والوں کو	مگر بلحاظ گمراہی کے	اس (سبب) سے جو

خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ	اُغْرِقُوْا	فَاُدْخِلُوْا نَارًا ۙ	فَلَمْ يَجِدُوْا لَهُمْ
ان کی خطائیں تھیں	ان کو غرق کیا گیا	پھر ان کو داخل کیا گیا ایک آگ میں	پھر انہوں نے نہیں پایا اپنے لیے

مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ	اَنْصَارًا ﴿٢٥﴾	وَقَالَ نُوْحٌ رَّبِّ	لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ
اللہ کے علاوہ	کچھ (دوسرے) مدد کرنے والے	اور کہا نوحؑ نے اے میرے رب	تو مت چھوڑ زمین پر

مِنَ الْكٰفِرِيْنَ	دَيَّارًا ﴿٢٦﴾	اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ	يُضِلُّوْا عِبَادَكَ
کافروں میں سے (کسی کو)	رہتا بستا ہوا	بیشک اگر تو نے چھوڑا ان کو	تو وہ گمراہ کریں گے تیرے بندوں کو

وَلَا يَلِدُوْٓا	اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ﴿٢٧﴾	رَبِّ اغْفِرْ لِيْ	وَلِوَالِدَيَّ
اور نہیں جنیں گے	مگر نافرمانی کرنے والا بڑا ہی ناشکرا	اے میرے رب تو بخش دے میرے لیے	اور میرے والدین کے لیے

وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ	مُؤْمِنًا	وَّلِلْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
اور اس کے لیے جو داخل ہوا میرے گھر میں	ایمان لانے والا ہوتے ہوئے	اور ایمان لانے والوں

وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ	وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِيْنَ	اِلَّا تَبَارًا ﴿٢٨﴾ ع
اور ایمان لانے والیوں کے لیے (گناہوں کو)	اور تو زیادہ مت کر ظالموں کو	مگر بلحاظ بربادی کے

نوٹ: 1 آیات۔15۔16 میں آسمان اور اس کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانے کے بعد آیات۔17۔18۔ میں زمین کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے۔سب سے پہلے زمین کی سب سے اشرف مخلوق یعنی انسان کو لیا ہے۔فرمایا کہ اللہ نے تمہیں زمین سے اگایا اور اگانے کے بعد پھر اسی میں

تمہیں مرنے کے بعد لوٹا دیتا ہے۔ اور پھر اسی سے تمہیں ایک دن نکالے گا۔ یہ قرآن کی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اس آیت میں جو دعویٰ ہے وہی اس دعوے کی نہایت واضح دلیل بھی ہے۔ اس کے مفہوم کو کھول دیجئے، تو بات یوں ہوگی کہ جس طرح زمین سے سبزہ اگتا ہے، اسی طرح اللہ نے تمہیں بھی اسی زمین سے اگایا ہے۔ اور جس طرح زمین سے اگنے والی چیزیں فنا ہو کر زمین میں مل جاتی ہیں، اسی طرح تم بھی مر کر زمین میں مٹی بن جاتے ہو۔ پھر جس طرح تم دیکھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے فنا شدہ سبزوں کو از سر نو زندہ کر دیتا ہے اسی طرح جب چاہے گا تمہیں بھی بغیر کسی زحمت کے اٹھا کھڑا کرے گا۔ (تدبر قرآن)۔

6940

نوٹ:2

آیت۔23۔ میں جن پانچ بتوں کا ذکر ہے ان کے متعلق امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ یہ پانچوں دراصل اللہ کے نیک وصالح بندے تھے جو حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیانی زمانے میں گزرے تھے۔ بہت سے لوگ ان کے معتقد اور پیروکار تھے اور عرصہ دراز تک لوگوں نے انہیں کے نقش قدم پر عبادت اور اللہ کے احکام کی اطاعت جاری رکھی۔ پھر شیطان نے ان کو سمجھایا کہ تم اپنے جن بزرگوں کی پیروی کرتے ہوئے عبادت کرتے ہو، اگر عبادت کے وقت ان کی تصویریں سامنے رکھ لیا کرو تو تمہاری عبادت بڑی مکمل ہو جائے گی اور تم کو خشوع و خضوع حاصل ہوگا۔ لوگ اس کے فریب میں آ گئے اور بزرگوں کے مجسمے بنا کر عبادت گاہ میں رکھنے لگے۔ مجسموں کو دیکھ کر بزرگوں کی یاد تازہ ہو جانے سے ایک خاص کیفیت محسوس کرنے لگے، یہاں تک کہ اسی حال میں یہ لوگ یکے بعد دیگرے مر گئے۔ جب نئی نسل نے ان کی جگہ لی تو شیطان نے ان کو یہ پڑھایا کہ تمہارے بزرگوں کے خدا اور معبود یہی بت تھے اور وہ انہی کی عبادت کرتے تھے۔ یہاں سے بت پرستی شروع ہوگئی۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔25۔ کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی خطاؤں، کفر وشرک کی وجہ سے پانی میں غرق کیے گئے تو آگ میں داخل ہو گئے۔ یہ متضاد عذاب کہ ڈوبے پانی میں اور نکلے آگ میں، حق تعالیٰ کی قدرت سے کیا بعید ہے اور ظاہر ہے کہ یہاں جہنم کی آگ تو مراد نہیں ہے کیونکہ اس میں داخلہ تو قیامت کے حساب کتاب کے بعد ہوگا۔ یہ برزخی آگ ہے جس میں داخل ہونے کی قرآن کریم نے خبر دی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ عالم برزخ میں رہنے کے زمانے میں بھی مردوں پر عذاب ہوگا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ جب قبر میں بدعمل کو عذاب ہوگا تو نیک عمل والوں کو ثواب اور نعمت بھی ملے گی۔ احادیث متواترہ میں قبر کے اندر عذاب وثواب ہونے کا بیان اس کثرت اور وضاحت سے آیا ہے کہ انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس پر امت کا اجماع ہے۔ (معارف القرآن)۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الجن (72)

آیت نمبر (1 تا 9)

ج ر س

حَرْسًا حفاظت کرنا۔ پہرہ دینا۔

حَارِسٌ ج حَرَسٌ۔ فَاعِلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ حفاظت کرنے والا۔ چوکیدار۔ پہرے دار۔

حَرَسِیٌّ ج حَرَسٌ۔ اسم الجمع ہے۔ محافظوں کا دستہ۔ باڈی گارڑوں کا دستہ۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

ترکیب

آیات۔1۔3۔4۔6۔ میں اَنَّہٗ کے الفاظ آئے ہیں۔ ان ضمیروں کا کوئی مرجع نہیں ہے، اس لیے یہ سب ضمیر الشان ہیں۔ دیکھیں آیت۔2/85، نوٹ۔1) یہاں پر لفظ قُرْاٰنًا، کلام اللہ کے اسم علم کے طور پر نہیں بلکہ اپنے لغوی معنی میں آیا ہے، دیکھیں

آیت۔2/البقرۃ:185۔مادہ ''ق رء''۔(آیت۔5) یہاں تَقُوْلَ واحد مؤنث کا صیغہ ہے۔قاعدہ یہ ہے کہ فاعل اگر اسم ظاہر ہو تو فعل ہمیشہ واحد آتا ہے، البتہ جنس میں اس کا صیغہ اسم ظاہر کی جنس کے مطابق ہوتا ہے۔لیکن اگر اسم ظاہر عاقل کی جمع مکسر ہو یا اسم الجمع ہو یا مؤنث غیر حقیقی ہو، تو پھر فعل واحد مذکر اور واحد مؤنث، دونوں طرح سے لانا جائز ہے۔یہاں اَلْاِنْسُ وَالْجِنُّ اسم الجمع ہیں اس لیے واحد مؤنث کا صیغہ بھی جائز ہے۔(آیت۔6) فَزَادُوْهُمْ میں زَادُوْا کی ضمیر فاعلی رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ کے لیے بھی ہوسکتی ہے اور رِجَالٌ مِّنَ الْجِنِّ کے لیے بھی۔اسی طرح هُمْ کی ضمیر مفعولی کو بھی دونوں میں سے کسی کے لیے بھی ماننے کی گنجائش موجود ہے۔دونوں مؤنث کی ضمیر سے آتی ہے۔یہاں هُمْ کی ضمیری اَنَّ کا اسم ہے اور ظَنُّوْا جملہ فعلیہ بن کر اَنَّ کی خبر ہے اور هُمْ کی ضمیر انسانوں کے لیے ہے بَعَثَ کا اصل مفہوم ہے کسی کو اٹھا کر کسی طرف بھیجنا۔اس لیے یہ لفظ اٹھانا اور بھیجنا، دونوں معانی میں آتا ہے۔یہاں لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ اَحَدًا کا یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ کسی کو قبر سے نہیں اٹھائے گا اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ اللہ اب کوئی رسول نہیں بھیجے گا۔دونوں ترجمے درست ہوں گے۔

ترجمہ

قُلْ اُوْحِيَ اِلَيَّ	اَنَّهُ	اسْتَمَعَ نَفَرٌ	مِّنَ الْجِنِّ
آپؐ کہیے وحی کیا گیا میری طرف	کہ حقیقت یہ ہے کہ	دھیان سے سنا ایک ایسی ٹولی نے جو	جنوں میں سے تھی

فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا	قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ﴿۱﴾	يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ
پھر انہوں نے کہا بیشک ہم نے سنا	ایک عجیب پڑھی جانے والی چیز	جو ہدایت دیتی ہے نیک راہ کی طرف

فَاٰمَنَّا بِهٖ ؕ	وَلَنْ نُّشْرِكَ	بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ﴿۲﴾	وَّاَنَّهٗ
تو ہم ایمان لائے اس پر	اور ہم ہرگز شریک نہیں کریں گے	اپنے رب کے ساتھ کسی ایک کو (بھی)	اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ

تَعٰلٰى جَدُّ رَبِّنَا	مَا اتَّخَذَ	صَاحِبَةً	وَّلَا وَلَدًا ۙ﴿۳﴾
بلند ہوئی ہمارے رب کی عظمت	اس نے نہیں بنایا	کوئی ساتھی (بیوی)	اور نہ کوئی اولاد

وَّاَنَّهٗ	كَانَ يَقُوْلُ	سَفِيْهُنَا	عَلَى اللّٰهِ	شَطَطًا ۙ﴿۴﴾	وَّاَنَّا ظَنَنَّآ
اور یہ کہ سچ یہ ہے کہ	کہا کرتا تھا	ہم میں کا بیوقوف (سردار)	اللہ پر (باتیں)	حد سے گزرتے ہوئے	اور یہ کہ ہم نے گمان کیا

اَنْ لَّنْ تَقُوْلَ	الْاِنْسُ وَالْجِنُّ	عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۙ﴿۵﴾	وَّاَنَّهٗ	كَانَ رِجَالٌ	مِّنَ الْاِنْسِ
کہ ہرگز نہیں کہیں گے	انسان اور جن	اللہ پر کوئی جھوٹ	اور یہ کہ حقیقت یہ ہے کہ	تھے کچھ ایسے مرد	انسانوں میں سے

يَعُوْذُوْنَ	بِرِجَالٍ	مِّنَ الْجِنِّ	فَزَادُوْهُمْ
جو پناہ پکڑتے تھے	کچھ ایسے مردوں کی جو	جنوں میں سے تھے	تو انہوں (انسانوں) نے زیادہ کیا ان (جنوں) کو

رَهَقًا ۙ﴿۶﴾	وَّاَنَّهُمْ ظَنُّوْا	كَمَا ظَنَنْتُمْ	اَنْ لَّنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ
بلحاظ چڑھنے کے	اور یہ کہ ان (انسانوں) نے گمان کیا	جیسے تم (جن) لوگوں نے گمان کیا	ہرگز نہیں اُٹھائے گا اللہ

اَحَدًا ۙ	وَّ اَنَّا لَمَسْنَا السَّمَآءَ	فَوَجَدْنٰهَا	مُلِئَتْ
کسی ایک کو (بھی قبر سے)	اور یہ کہ ہم نے بیشک چھوا (ٹٹولا) آسمان کو	تو ہم نے پایا اس کو	(کہ) اس کو بھر دیا گیا

حَرَسًا شَدِيْدًا	وَّ شُهُبًا ۙ	وَّ اَنَّا كُنَّا نَقْعُدُ	مِنْهَا مَقَاعِدَ
بڑے سخت محافظوں کے دستوں سے	اور انگاروں سے	اور یہ کہ ہم بیٹھا کرتے تھے	اس (آسمان) میں بیٹھنے کی جگہوں (مورچوں) پر

لِلسَّمْعِ ؕ	فَمَنْ يَّسْتَمِعِ الْاٰنَ	يَجِدْ لَهٗ	شِهَابًا رَّصَدًا ۙ
سننے کے لیے	پس جو (کوئی) سنتا ہے اب	تو وہ پاتا ہے اپنے لیے	ایک گھات میں بیٹھنے والا انگارہ

نوٹ: 1

یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ جنوں کی حقیقت کیا ہے تاکہ ذہن کسی الجھن کا شکار نہ ہو۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ جن کسی حقیقی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ بھی پرانے زمانے کے اوہام میں سے ایک بے بنیاد خیال ہے۔ مسلمانوں میں سے جو لوگ اس طرز فکر سے متاثر ہیں، مگر قرآن کا انکار بھی نہیں کر سکتے، انہوں نے جن، ابلیس اور شیطان کے متعلق قرآن کے صاف صاف بیانات کو طرح طرح کی تاویلات کا تختۂ مشق بنایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد کوئی ایسی پوشیدہ مخلوق نہیں ہے جو اپنا ایک مستقل وجود رکھتی ہو، بلکہ کہیں تو اس سے مراد انسان کی اپنی بہیمی قوتیں ہیں جنہیں شیطان کہا گیا ہے اور کہیں اس سے مراد وحشی اور جنگلی اور پہاڑی قومیں ہیں اور کہیں اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو چھپ چھپ کر قرآن سنا کرتے تھے لیکن قرآن مجید کے ارشادات اس معاملہ میں اس قدر صاف اور صریح ہیں کہ ان تاویلات کے لیے ان کے اندر کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن میں بکثرت مقامات پر جن اور انسان کا ذکر اس حیثیت سے کیا گیا ہے کہ یہ دو الگ قسم کی مخلوقات ہیں۔ سورۂ رحمٰن تو پوری کی پوری اس پر ایسی صریح شہادت دیتی ہے کہ جنوں کو انسانوں کی کوئی قسم سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتی۔ اعراف۔12، فجر۔26۔27، رحمٰن۔14۔15 میں صاف صاف بتایا گیا کہ انسان کا مادۂ تخلیق مٹی ہے اور جنوں کا مادۂ تخلیق آگ ہے۔ سورۃ حجر۔27۔ میں صراحت کی گئی کہ جن انسان سے پہلے پیدا کیے گئے اسی بات پر قصہ آدم و ابلیس شہادت دیتا ہے جو قرآن میں سات مقامات پر بیان ہوا ہے اور ہر جگہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیق کے وقت ابلیس موجود تھا۔ پھر سورۂ کہف۔ 50۔ میں بتایا گیا کہ ابلیس جنوں میں سے ہے۔ سورۂ اعراف۔ 27۔ میں صاف الفاظ میں کہا گیا ہے کہ جن انسانوں کو دیکھتے ہیں مگر انسان ان کو نہیں دیکھتے۔ سورۃ حجر۔16 تا18، سورۂ صافات۔6 تا10، اور سورۂ ملک۔5 میں بتایا گیا ہے کہ جن عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ اس سے مشرکین کے اس خیال کی تردید کی گئی ہے کہ جن غیب کا علم رکھتے ہیں۔ اسی خیال کی تردید سورۂ سبا۔14۔ میں بھی کی گئی ہے۔ سورۂ بقرہ۔30 تا34۔ اور سورۂ کہف۔50۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی خلافت اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہے اور انسان جنوں سے افضل مخلوق ہے اگرچہ بعض غیر معمولی طاقتیں جنوں کو بھی بخشی گئی ہیں، جن کی ایک مثال سورۂ نمل۔7۔ میں ملتی ہے۔ لیکن اس طرح بعض طاقتیں حیوانات کو بھی انسان سے زیادہ ملی ہیں اور وہ اس بات کی دلیل نہیں ہیں کہ جانوروں کو انسان پر فضیلت حاصل ہے۔ قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جن انسان کی طرح ایک با اختیار مخلوق ہے اور اس کو کفر و ایمان کا ویسا ہی اختیار دیا گیا ہے جیسا انسان کو دیا گیا ہے۔ قرآن میں یہ حقیقت بھی بیان کی گئی ہے کہ ابلیس کی تخلیقِ آدم کے وقت ہی یہ عزم کر لیا تھا کہ وہ نوع انسانی کو گمراہ کرے گا اور اسی وقت سے شیاطین جن انسان کو گمراہ کرنے کے درپے ہیں مگر وہ زبردستی کوئی کام

کرانے کی طاقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس کے دل میں وسوسے ڈالتے ہیں اور بدی وگمراہی کو خوشنما بنا کر پیش کرتے ہیں۔ 6940

ان تفصیلات سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ جن انسان سے الگ ایک دوسری ہی نوع کی پوشیدہ مخلوق ہیں۔ان کی پراسرار صفات کی وجہ سے جاہل لوگوں نے ان کے متعلق بڑے مبالغہ آمیز تصورات قائم کررکھے ہیں حتیٰ کہ ان کی پرستش تک کرڈالی ہے۔مگر قرآن نے ان کی اصل حقیقت پوری طرح کھول کر بیان کر دی ہے جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ج۶،ص۱۰۹تا۱۱۱)

نوٹ:2

آیات۔4۔5 سے مراد یہ ہے کہ ایمان لانے والے جنات نے اب تک شرک وکفر میں مبتلا رہنے کا عذر یہ بیان کیا کہ ہماری قوم کے بے وقوف لوگ اللہ تعالیٰ کی شان میں بے سروپا باتیں کیا کرتے اور ہمیں یہ گمان نہ تھا کہ کوئی انسان یا جن اللہ کی طرف جھوٹی بات کی نسبت کرسکتا ہے اس لیے ان بے وقوفوں کی باتوں میں آکر آج تک ہم کفروشرک میں مبتلا تھے۔اب قرآن سنا تو حقیقت کھلی۔(معارف القرآن)۔

ان آیات سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ جنات عوام کے طبقہ سے تھے'ان کے سردار جس ڈگر پر ان کو چلاتے رہے،اس پر وہ چلتے رہے۔ لیکن جب حقیقت ان پر واضح ہوگئی تو انہوں نے ان کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں سے نکال پھینکا اور اللہ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم پر چل پڑے۔آنحضرت ﷺ کے واسطہ سے قریش کے عوام کو یہ باتیں اس لیے سنائی گئیں کہ ان کے اندر بھی اپنے احمق لیڈروں کے پھندے سے نکلنے اور اپنی عقل وبصیرت پر اعتماد کرنے کا حوصلہ پیدا ہو(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

عربی لغت میں لفظ سَمَاءٌ جس طرح آسمان کے لیے بولا جاتا ہے اسی طرح بادل پر بھی لفظ سَمَاءٌ کا اطلاق عام اور معروف ہے۔آیت۔8۔ میں بظاہر سَمَاءٌ سے مراد یہی بادل ہے۔اور جنات لوگوں کا آسمانی خبریں سننے کے لیے آسمان تک جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ بادلوں تک جاتے تھے اور وہاں سے آسمانی خبریں سنتے تھے۔اس کی دلیل حضرت عائشہؓ کی حدیث ہے۔آپؓ فرماتی ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ فرشتے عنان سماء میں اترتے ہیں جس کے معنی بادل کے ہیں۔وہاں وہ ان فیصلوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے آسمان میں جاری فرمائے ہیں۔یہاں سے شیاطین یہ خبریں چراتے ہیں اور سن کر کاہنوں کے پاس لاتے ہیں اور اس میں اپنی طرف سے سو جھوٹ ملا کر ان کو بتاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے شیاطین کا آسمانی خبریں سن کر کاہنوں تک پہنچانے کا سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے جاری تھا مگر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت آسمانی وحی کی حفاظت کے لیے اس سلسلہ کو اس طرح بند کر دیا گیا کہ جب کوئی شیطان خبریں سننے کے لیے اوپر آتا تو اس کی طرف شہاب ثاقب کا انگارہ پھینک کر اس کو دفع کر دیا جاتا ہے۔یہی وہ نیا حادثہ تھا جس کی تحقیق حال کے لیے دنیا کی مشرق ومغرب میں جنوں نے وفود بھیجے پھر مقام نخلہ میں رسول اللہ ﷺ سے قرآن سن کر جنوں کے ایک وفد کا ایمان لانا اس سورۂ میں ذکر فرمایا گیا۔یہاں یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شہاب ثاقب جس کو عرفِ عام میں ستارہ ٹوٹنا کہتے ہیں، یہ تو دنیا میں قدیم زمانے سے ہوتا آیا ہے، جب کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہد نبوی کی خصوصیت ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ شہابِ ثاقب کا وجود تو ابتداء عالم سے ہے مگر اس آتشیں مادہ سے شیاطین کو دفع کرنے کا کام رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے شروع ہوا اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ جتنے شہاب ثاقب نظر آتے ہیں، سب سے ہی یہ کام لیا جاتا ہو۔(معارف القرآن)۔

آیت نمبر (10 تا 19)

6940

ھ ر ب

(ن) هَرْبًا تیز چلنا۔ بھاگنا۔ زیر مطالعہ آیت۔12۔

ح ر ی

(ض) حَرْيًا کسی چیز کا گھٹنا۔ کم ہونا۔
(تفعل) تَحَرِّی دو چیزوں میں سے بہتر کو کوشش کر کے حاصل کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ح ط ب

(ض) حَطْبًا (ا) لکڑی چننا۔ (آگ جلانے کے لیے) (۲) چغلی کھانا، افتراء باندھنا۔ (لڑائی کی آگ جلانے کے لیے)۔
حَطَبٌ اسم ذات ہے۔ (ا) ایندھن۔ زیر مطالعہ آیت۔ 15۔ (۲) چغلی۔ ﴿حَمَّالَةَ الْحَطَبِ﴾ (111/اللھب:4) ''(چغلی کو اٹھانے یعنی لیے پھرنے والی)۔

غ د ق

(س) غَدَقًا بارش کا خوب برسنا۔ کسی چیز کا وافر ہونا۔ زیر مطالعہ آیت۔16۔

ل ب د

(ن) لُبُوْدًا گھیرنا۔ چمٹنا۔ گتھ جانا۔
لِبَدًا ج۔ لِبَدٌ۔ تہہ بہ تہہ جمی ہوئی اون۔ لوگوں کا جوق در جوق جمع ہونے والا گروہ۔ زیر مطالعہ آیت۔19۔
لُبَدًا ج لُبَدٌ۔ شیر کی گردن کے بال جو بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر کسی چیز کی بہتات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ﴿يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا﴾ (90/البلد:6) ''وہ کہتا ہے میں نے ہلاک کیا یعنی خرچ کیا ڈھیروں مال۔''

ترکیب

(آیت۔10) لَا نَدْرِیْ کے آگے اَشَرٌّ سے لے کر رَشَدًا تک پورا جملہ نَدْرِیْ کا مفعول ہے۔ اُرِيْدَ ماضی مجہول ہے اور اس کا نائب فاعل ہونے کی وجہ سے شَرٌّ حالت رفع میں ہے (آیت۔16) اَلطَّرِيْقَةِ پر لام تعریف ہے اس کا معہودِ ذہنی صحیح راستہ کو بھی مانا جا سکتا ہے اور غلط راستہ کو بھی، کیونکہ قرآن مجید میں دونوں طرح کی آزمائش کا ذکر ہے۔ سورۃ الانعام کی آیات۔43۔44) میں نافرمانوں پر آخری عذاب نازل کرنے سے پہلے نعمتوں کے تمام دروازے کھولنے کا ذکر ہے اور سورۃ الانبیاء کی آیت۔35۔ میں اس اصول کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نیک و بد تمام انسانوں کو دے کر بھی آزماتا ہے اور لے کر بھی آزماتا ہے۔ اس لیے یہاں اَلطَّرِيْقَةِ سے صحیح اور غلط دونوں راستے مراد لینا ممکن ہے۔ البتہ اس سے پہلے اَسْتَقَامُوْا آیا ہے اور استقامت کا لفظ عموماً صحیح راستہ کے لیے آتا ہے۔ اس لیے ہماری ترجیح یہ ہے کہ یہاں صحیح راستہ مراد لیا جائے۔ (حافظ احمد یار صاحب)

پیچھے پہلی آیت میں فَقَالُوْٓا سے جنوں کا قول شروع ہوا تھا اور اس کے لیے مسلسل اَنَّا (کہ ہم) سے بات شروع ہوتی رہی ہے اب یہاں اَنَّا (کہ ہم) کے بجائے اَنْ (کہ) آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ آیت پر جنوں کا قول ختم ہو گیا اور اس اَنْ کا تعلق پہلی آیت کے

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ سے ہے۔(آیت۔19)۔عَبْدُ اللّٰہِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔یَدْعُوْہُ حال ہے۔یَکُوْنُوْنَ کی ضمیر فاعلی ھُمْ کو مشرکوں کے لیے بھی مانا گیا ہے لیکن سارا ذکر جنوں کا چلا آرہا ہے اس لیے ہماری ترجیح ہے کہ اس کو جنوں کے لیے مانا جائے۔6940

ترجمہ

وَّ اَنَّا لَا نَدْرِیْٓ	اَشَرٌّ اُرِیْدَ	بِمَنْ فِی الْاَرْضِ	اَمْ اَرَادَ بِھِمْ
اور یہ کہ ہم نہیں جانتے	آیا کسی برائی (عذاب) کا ارادہ کیا گیا	ان کے بارے میں جو زمین میں ہیں	یا ارادہ کیا ان کے بارے میں

رَبُّھُمْ رَشَدًا ﴿۱۰﴾	وَّ اَنَّا مِنَّا الصّٰلِحُوْنَ	وَمِنَّا دُوْنَ ذٰلِكَ ؕ	كُنَّا طَرَآىِٕقَ قِدَدًا ﴿۱۱﴾
ان کے رب نے کسی بھلی راہ کا	اور یہ کہ ہم میں نیک لوگ (بھی) ہیں	اور ہم میں اس کے علاوہ (بھی) ہیں	ہم تھے مختلف الرّائے طریقوں پر

وَّ اَنَّا ظَنَنَّآ	اَنْ لَّنْ نُّعْجِزَ	اللّٰهَ فِی الْاَرْضِ	وَلَنْ نُّعْجِزَهٗ
اور یہ کہ ہم نے گمان کیا (سمجھ لیا)	کہ ہم ہرگز عاجز نہ کرسکیں گے	اللہ کو زمین میں	اور ہم ہرگز عاجز نہ کرسکیں گے اس کو

ھَرَبًا ﴿۱۲﴾	وَّ اَنَّا لَمَّا سَمِعْنَا	الْھُدٰٓی	اٰمَنَّا بِهٖ ؕ	فَمَنْ یُّؤْمِنْۢ بِرَبِّهٖ
بلحاظ بھاگنے کے	اور یہ کہ جب ہم نے سنا	اِس ہدایت (قرآن) کو	تو ہم ایمان لائے اُس پر	پھر جو ایمان لاتا ہے اپنے رب پر

فَلَا یَخَافُ بَخْسًا	وَّلَا رَھَقًا ﴿۱۳﴾	وَّ اَنَّا مِنَّا الْمُسْلِمُوْنَ
تو وہ خوف نہیں کرتا کسی حق تلفی کا	اور نہ کسی زیادتی کا	اور یہ کہ ہم میں فرمانبرداری کرنے والے (بھی) ہیں

وَمِنَّا الْقٰسِطُوْنَ ؕ	فَمَنْ اَسْلَمَ	فَاُولٰٓئِكَ تَحَرَّوْا	رَشَدًا ﴿۱۴﴾
اور ہم میں بے انصافی کرنے والے (بھی) ہیں	تو جس نے فرمانبرداری کی	تو ان لوگوں نے پالیا	بھلی راہ کو

وَ اَمَّا الْقٰسِطُوْنَ	فَكَانُوْا لِجَهَنَّمَ حَطَبًا ﴿۱۵﴾	وَّ اَنْ
اور وہ جو ناانصافی کرنے والے ہیں	تو وہ لوگ جہنم کے ایندھن ہیں	اور (وہی کیا گیا میری طرف) کہ

لَّوِ اسْتَقَامُوْا	عَلَى الطَّرِیْقَةِ	لَاَسْقَیْنٰهُمْ	مَّآءً غَدَقًا ﴿۱۶﴾
اگر وہ لوگ استقامت اختیار کرتے	اس (سیدھے) راستے پر	تو ہم ضرور پینے کے لیے دیتے ان کو	وافر پانی

لِّنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ ؕ	وَمَنْ یُّعْرِضْ	عَنْ ذِكْرِ رَبِّهٖ	یَسْلُكْهُ
تاکہ ہم آزمائیں ان کو اس (پانی کے استعمال میں)	اور جو اعراض کرے گا	اپنے رب کی یاد سے	تو وہ (رب) ڈال دے گا اس کو

عَذَابًا صَعَدًا ﴿۱۷﴾	وَّ اَنَّ	الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ	فَلَا تَدْعُوْا
ایک چڑھائی والے (مسائل والے) عذاب میں	اور (وحی کیا گیا) کہ	تمام سجدہ گاہیں اللہ کے لیے ہیں	پس تم لوگ مت پکارو

مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا ﴿۱۸﴾	وَّ اَنَّهٗ	لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ
اللہ کے ساتھ کسی ایک کو	اور حقیقت یہ ہے کہ	جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ

یَدْعُوْهُ	كَادُوْا یَكُوْنُوْنَ	عَلَیْهِ	لِبَدًا ﴿۱۹﴾
اس کو پکارتے ہوئے	لگتے تھے کہ وہ (جن) ہو جائیں گے	اس (بندے) پر	گھیرا ڈالنے والے گروہ در گروہ

نوٹ:1

اس (آیت۔10) سے معلوم ہوا کہ عالمِ بالا میں اس قسم کے غیر معمولی انتظامات (جس کا ذکر گزشتہ آیت میں کیا گیا ہے) دو ہی حالتوں میں کیے جاتے تھے ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اہل زمین پر کوئی عذاب نازل کرنے کا فیصلہ کیا ہو اور منشائے الٰہی یہ ہو کہ اس کے نزول سے پہلے جن اس کی بھنک پا کر اپنے دوست انسانوں کو خبردار نہ کر دیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ نے زمین میں کسی رسول کو مبعوث فرمایا ہو اور تحفظ کے ان انتظامات سے مقصود یہ ہو کہ رسول کی طرف جو پیغامات بھیجے جا رہے ہیں، ان میں نہ تو شیاطین کسی قسم کی خلل اندازی کر سکیں اور نہ قبل از وقت یہ معلوم کر سکیں کہ پیغمبر کو کیا ہدایات دی جا رہی ہیں۔ پس جنوں کے اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم نے آسمان میں یہ چوکی پہرے دیکھے تو ہمیں یہ معلوم کرنے کی فکر ہوئی کہ ان دونوں صورتوں میں سے کون سی صورت درپیش ہے۔ اسی تلاش میں ہم نکلے تھے کہ ہم نے وہ حیرت انگیز کلام سنا اور ہمیں معلوم ہو گیا کہ اللہ نے خلق خدا کو راہِ راست دکھانے کے لیے ایک رسول مبعوث فرمایا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔ 11۔ کا مطلب یہ ہے کہ اب تک تو نیکی اور بدی کے درمیان ہماری نگاہوں میں کوئی فرق نہ تھا۔ برے اور بھلے دونوں ہماری نظروں میں یکساں تھے لیکن اس قرآن نے ہمارا یہ مغالطہ دور کر دیا ہے اور یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہمارے طریقے اور راہیں الگ الگ ہیں اور ضروری ہے کہ ہم اس فرق کو ملحوظ رکھ کر لوگوں کے ساتھ معاملہ کریں۔ ہمارے درمیان وصل و فصل کی بنیاد ایمان و کفر کو ہونا چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو ہمارے قبیلہ کا ہے وہ ہمارا ہے، چاہے کافر ہو یا مومن، نیک ہو یا بد۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

مفتی محمد شفیعؒ کے ایک کتابچے ''ذکر اللہ'' کے مطابق ذکر۔ ورد۔ تسبیح وغیرہ ذکر اللہ نہیں ہیں بلکہ ذریعہ ذکر ہیں یعنی یہ بندے کو ذکر اللہ کی منزل تک پہنچانے کے ذرائع ہیں۔ ذکر۔ ورد۔ تسبیح وغیرہ میں اللہ کو یاد کرنے والے کلمات کی تکرار کرتے ہوئے جب بندہ اُس مقام پر پہنچ جائے کہ زندگی کی گہما گہمی کے بیچ منجدھار میں معاملات کرتے وقت اسے اللہ کے احکام یاد آنے لگیں اور وہ ان کے مطابق معاملات کرے، تو یہ ذکر اللہ ہے۔ اس بات کی تائید اُس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی اس نے اللہ کو یاد کیا، اگرچہ اس کی نماز، روزہ (نفلی) وغیرہ کم ہوں اور جس نے احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کی اس نے اللہ کو بھلا دیا، اگرچہ اس کی نماز، روزہ (نفلی) تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔ (آیت۔20/طٰہٰ:152، نوٹ۔1)

اس حوالہ سے اب اس بات کو سمجھ لیں کہ زیر مطالعہ آیت۔ 17۔ میں ذِکْرِ رَبِّہٖ سے مراد یہی ذکر اللہ ہے، تسبیحات وغیرہ نہیں ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص فرض نماز، روزوں وغیرہ کا اہتمام تو کرتا ہے لیکن ذکر، ورد، تسبیح وغیرہ کا اہتمام نہیں کرتا تو وہ اس کے اضافی ثواب سے محروم رہے گا، لیکن اس بنیاد پر وہ عذاب کا مستحق نہیں ہوگا۔ عذاب کا مستحق تو وہ ہوگا جس نے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کی، اگرچہ اس کی نماز، روزے، تسبیحات وغیرہ زیادہ ہوں۔

اللہ کی یاد سے یعنی اس کی قائم کردہ حدود و قیود سے اعراض کرتے ہوئے یعنی کَنّی کتراتے ہوئے زندگی بسر کرنے والے کی نقد سزا یہ ہے کہ اسے اسی دنیا میں عَذَابًا صَعَدًا میں جھونک دیا جاتا ہے۔ صَعِدَ۔ یَصْعَدُ کے معنی ہیں سیڑھی پر چڑھنا۔ چڑھائی چڑھنا۔ اس میں آدمی بلند سے بلند تر سطح پر پہنچتا رہتا ہے، اس لیے اس میں ترقی پذیری کا مفہوم پیدا ہوتا ہے اور چڑھائی چڑھنا مشقت طلب کام بھی ہے اس لیے اس میں مشکل کا مفہوم بھی ہے۔ لیکن یہاں عَذَابًا صَعَدًا کا واضح مفہوم یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس کی زندگی الجھنوں، پریشانیوں اور مسائل کا شکار ہو کر رہ جاتی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پریشانی آتی رہتی ہے اور اسے زندگی میں اطمینان و سکون نصیب نہیں ہوتا اور اس کی زندگی ہانپتے کانپتے ہی بسر ہوتی ہے۔ پھر جب اس دنیا میں آنکھ بند ہوتی ہے اور اُس دنیا میں کھل جاتی ہے تو اس عذاب کی چوٹی سامنے آجاتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدی اور حساب و کتاب کے وقت حسرت اور کیفیات۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہر قسم کے عذاب سے اپنی پناہ میں رکھے۔

آیت نمبر (20تا28)

6940

ترکیب

(آیت۔22) مُلْتَحَدًا باب افتعال سے اسم المفعول ہے جو یہاں اسم الظرف کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ (آیت۔23) بَلٰغًا اور رِسٰلٰتِهٖ، یہ دونوں لَنْ اَجِدَ مُلْتَحَدًا سے مستثنیٰ ہیں اور یہ مستثنیٰ منقطع ہے۔ اس لیے یہ دونوں حالتِ نصب میں ہیں۔ (دیکھیں آیت۔ 2/البقرۃ:34، نوٹ۔1) (آیت۔25۔26) رَبِّیْ پر یائے متکلم ہے اس لیے اس کی رفع، نصب ختم ہوگئی ہے۔ اس آیت میں یہ یَجْعَلُ کا فاعل ہونے کی وجہ سے حالت رفع میں ہے۔ عٰلِمُ الْغَیْبِ اس کا بدل ہے اس لیے عٰلِمُ حالت رفع میں آیا ہے۔

ترجمہ

قُلْ اِنَّمَآ	اَدْعُوْا رَبِّیْ	وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۰﴾
آپ کہہ دیں کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	میں پکارتا ہوں اپنے رب کو	اور میں شریک نہیں کرتا اس کے ساتھ کسی ایک کو

قُلْ اِنِّیْ	لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ	ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ﴿۲۱﴾
آپ کہہ دیں کہ میں	اختیار نہیں رکھتا تم لوگوں کے لیے	کسی تکلیف کا اور نہ کسی بھلی راہ کا

قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ	مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ۙ	وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ
آپ کہیے کہ ہرگز نہیں بچائے گا مجھ کو	اللہ سے کوئی ایک بھی	اور میں ہرگز نہیں پاؤں گا اس کے علاوہ

مُلْتَحَدًا ﴿۲۲﴾	اِلَّا بَلٰغًا	مِّنَ اللّٰهِ	وَرِسٰلٰتِهٖ ؕ
کوئی پناہ گاہ	سوائے اس کے کہ پہنچانا (حق کو)	اللہ (کی طرف) سے	اور اس کے پیغامات کو

وَمَنْ یَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ	خٰلِدِیْنَ فِیْهَآ	اَبَدًا ﴿۲۳﴾
اور جو نافرمانی کرے گا اللہ کی اور اس کے رسول کی	تو یقیناً اس کے لیے ہی جہنم کی آگ ہے	ایک حالت میں رہنے والے اس میں	ہمیشہ ہمیش

حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا	مَا یُوْعَدُوْنَ	فَسَیَعْلَمُوْنَ	مَنْ اَضْعَفُ	نَاصِرًا
یہاں تک کہ جب وہ دیکھیں گے	اس کو جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے	تو وہ لوگ جان لیں گے	کہ کون زیادہ ضعیف ہے	بلحاظ مددگار کے

وَّاَقَلُّ عَدَدًا ﴿۲۴﴾	قُلْ اِنْ اَدْرِیْٓ	اَقَرِیْبٌ	مَّا تُوْعَدُوْنَ	اَمْ یَجْعَلُ لَهٗ رَبِّیْٓ
اور زیادہ قلیل ہے بلحاظ گنتی کے	آپ کہیے میں نہیں جانتا	آیا قریب ہے	وہ جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے	یا مقرر کرے گا اس کے لیے میرا رب

اَمَدًا ﴿۲۵﴾	عٰلِمُ الْغَیْبِ	فَلَا یُظْهِرُ عَلٰى غَیْبِهٖٓ	اَحَدًا ﴿۲۶﴾
کوئی مدت	جو تمام غیب کا جاننے والا ہے	تو وہ مطلع نہیں کرتا اپنے غیب پر	کسی ایک کو

اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى	مِنْ رَّسُوْلٍ	فَاِنَّهٗ یَسْلُكُ	مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ	وَمِنْ خَلْفِهٖ
سوائے اس کے جس کو اس نے پسند کیا	کسی رسول میں سے	پھر بیشک وہ چلاتا ہے	اس (رسول) کے آگے	اور اس کے پیچھے

رَصَدًا ﴿۲۷﴾	لِّیَعْلَمَ اَنْ	قَدْ اَبْلَغُوْا	رِسٰلٰتِ رَبِّهِمْ
پہرہ دینے والے	تاکہ وہ جان لے کہ	ان لوگوں (فرشتوں اور رسولوں) نے پہنچا دیے ہیں	اپنے رب کے پیغامات

وَاَحَاطَ بِمَا لَدَيْهِمْ	وَاَحْصٰى	كُلَّ شَيْءٍ	عَدَدًا ﴿۲۸﴾
اوراس نے احاطہ کیااس کا جوان کے پاس ہے	اوراس نے شمار پورا کیا	ہر چیز کا	بلحاظ گنتی کے

نوٹ:1

آیت۔23۔ میں اِلاَّ بَلٰغًا کا تعلق آیت۔21۔ میں لَا اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا سے بھی مانا گیا ہے، ایسی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ میں نہ تمہارے مطالبہ پر تمہیں عذاب دکھا سکتا ہوں اور نہ تمہارے دلوں میں ہدایت اتار سکتا۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ اللہ نے جو پیغام دے کر مجھے بھیجا ہے وہ بے کم وکاست میں تمہیں پہنچادوں اوراس کے حکموں سے تمہیں آگاہ کردوں۔ (تدبر قرآن)۔

دوسری طرف اِلاَّ بَلٰغًا کا تعلق آیت۔22۔ میں لَنْ اَجِدَ مُلْتَحَدًا سے مانا گیا ہے۔ ایسی صورت میں مطلب یہ ہے کہ تمہارے بُرے بھلے کا اختیار رکھنا تو درکنار، مجھے خود اپنے بُرے بھلے کا بھی اختیار نہیں ہے۔ اگر میں اللہ کی نافرمانی کروں تو مجھے اس سے بچانے والا کوئی نہیں ہے اوراس کی پکڑ سے بچنے کے لیے کوئی پناہ گاہ بھی نہیں ہے۔ اگر کوئی پناہ گاہ ہے تو بس یہ ہے کہ میں اپنی ابلاغ کی ذمہ داری کو کماحقہٗ ادا کردوں۔ پھر میں اس کی گرفت سے بچ جاؤں گا اور وہ لوگ پکڑے جائیں گے جو اس کی نافرمانی کریں گے۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم کا کیسٹ ترجمہ قرآن)۔

اس آیت میں اللہ اوراس کے رسول کی نافرمانی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر گناہ اور نافرمانی کی سزا ابدی جہنم ہے بلکہ جس سلسلۂ کلام میں یہ بات کہی گئی ہے اس کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اوراس کے رسول کی طرف سے توحید کی جو دعوت دی گئی ہے اس کو جو شخص نہ مانے اور شرک سے باز نہ آئے تو اس کے لیے ابدی جہنم کی سزا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔25۔ میں رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا کہ جو لوگ آپ کو قیامت کا معین وقت بتلانے پر مجبور کرتے ہیں ان سے کہہ دیں کہ قیامت کا آنا تو یقینی ہے لیکن اس کے واقع ہونے کی صحیح تاریخ اللہ نے کسی کو نہیں بتلائی، اس لیے میں نہیں جانتا کہ وہ روزِ قیامت قریب آچکا ہے یا ابھی کچھ مدت باقی ہے۔ پھر اگلی آیت۔26۔ میں اس کی وجہ بتائی کہ قیامت کی تاریخ سے میری بے خبری اس لیے ہے کہ میں عالم الغیب نہیں ہوں بلکہ عالم الغیب ہونا صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ یہاں الغیب کا الف لام، استغراقِ جنس کے لیے ہے۔ مقصود اس کلام سے علم غیب کلی، جس سے جہان کا کوئی ذرہ مخفی نہ ہو، کی غیر اللہ کے لیے نفی اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے اثبات ہے۔ اُس غیب کلی پر وہ کسی کو غالب وقادر نہیں کرتا کہ کوئی جس غیب کو جب چاہے معلوم کرلے، البتہ منصب رسالت کے لیے جس قدر غیب کا علم کسی رسول کو دینا ضروری ہے وہ ان کو من جانب اللہ بذریعہ وحی دے دیا جاتا ہے اور وہ ایسے محفوظ طریقے سے دیا جاتا ہے کہ جب ان پر اللہ کی طرف سے کوئی وحی نازل ہوتی ہے تو اس کے ہر طرف فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے تاکہ شیاطین اس میں کوئی مداخلت نہ کرسکیں۔ اس میں اوّل تو لفظ ''رسول'' سے اس غیب کی نوعیت متعین کردی گئی جس کا علم رسول و نبی کو دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد جو علم غیب رسول و نبی کو دیا جاتا ہے اس کی نوعیت متعین کردی کہ وہ فرشتوں کے ذریعے بھیجا جاتا ہے اور وحی لانے والے فرشتوں کے گرد دوسرے فرشتوں کا پہرہ ہوتا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس علمِ غیب کا نبی ورسول کے لیے اثبات ہے وہ بعض اور مخصوص علم غیب ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ استثناء اصطلاحی لفظوں میں استثناء منقطع ہے۔ (معارف القرآن)۔

6940

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ المزمل (73)

آیت نمبر (1 تا 19)

ز م ل

(ن) زَمۡلًا کسی کو سواری پر پیچھے بٹھانا۔
(تفعل) تَزَمَّلًا اور اِزَّمَّلًا۔ کپڑے کو اپنے اوپر لپیٹ لینا۔
مُزَّمِّلٌ اسم الفاعل ہے۔ لپیٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔1

ب ت ل

(ن۔ض) بَتۡلًا کسی سے کوئی چیز کاٹ کر الگ کرنا۔
(تفعیل) تَبۡتِیۡلًا کسی سے کوئی چیز کاٹ کر مسلسل الگ رکھنا۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔
(تفعل) تَبَتَّلًا کسی سے کٹ کر الگ ہونا۔ سب ٹوٹ کر اللہ سے لَو لگانا۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

غ ص ص

(س) غَصَصًا کھانے یا پانی سے گلے میں پھندا لگنا۔ گلے میں اٹکنا۔
غُصَّۃٌ جس سے پھندا لگے۔ اٹکنے والی چیز۔ زیر مطالعہ آیت۔13۔

ك ث ب

كَثۡبًا جمع کرنا۔ اکٹھا کرنا۔ (متعدی) جمع ہونا۔ اکٹھا ہونا۔ (لازمی)
كَثِیۡبٌ فَعِیۡلٌ کا وزن ہے۔ دائمی طور پر اکٹھا ہونے والا۔ ریت کا ٹیلا۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ھ ی ل

(ض) هَیۡلًا مٹی ڈالنا۔ مٹی بکھیرنا۔
مَهِیۡلٌ مَفۡعُوۡلٌ (اجوف یائی میں مَفِیۡلٌ) کے وزن پر صفت ہے۔ بکھیری ہوئی۔ بھربھری مٹی۔ زیر مطالعہ آیت۔14

ترکیب

(آیت۔2)۔ قُمِ ثلاثی مجرد سے فعل امر ہے، جو کہ لازم ہے، اس کا مفعول نہیں آتا۔ اس لیے اَلَّیۡلَ ظرف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ (آیت۔3۔4) قَلِیۡلًا کا بدل ہونے کی وجہ سے نِصۡفَهٗ حالت نصب میں ہے اور اس میں ہٗ کی ضمیر اَلَّیۡلَ کے لیے ہے۔ اُنۡقُصۡ مِنۡهُ اور زِدۡ عَلَیۡهِ کی ضمیریں نِصۡفَهٗ کے لیے ہیں۔ (آیت۔8) تَبَتَّلۡ باب تفعیل کا فعل امر ہے۔ اس کے مفعول مطلق کے طور پر باب تفعیل کا مصدر تَبۡتِیۡلًا آیا ہے لیکن یہ معروف نہیں بلکہ مجہول کے معنی میں ہے۔ (آیت۔14) كَانَتِ کا اسم اَلۡجِبَالُ ہے جو کہ جمع ہے لیکن اس کے خبر كَثِیۡبًا مَّهِیۡلًا واحد لائی گئی ہے۔ یہ اسلوب اس حقیقت کی تاکید کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بلا استثناء ہر ایک پہاڑ كَثِیۡبًا مَّهِیۡلًا ہوگا۔ مَهِیۡلٌ مادہ ''م ھ ل'' سے فَعِیۡلٌ کا وزن نہیں ہے بلکہ یہ مادہ ''ھ ی ل'' کا اسم المفعول ہے۔ یہ ہم پڑھ چکے ہیں کہ اجوف

یائی کا اسم المفعول، مَفْعُوْلٌ کے وزن پر بھی آتا ہے اور مَفِیْلٌ کے وزن پر بھی جیسے مَبِیْعٌ (دیکھیں آسان عربی گرامر۔ حصہ سوم۔ پیراگراف ۔۵:۷۲)۔ یہ مَفِیْلٌ کے وزن پر ہے۔ (آیت ۔۱۸) اَلسَّمَآءُ مبتدا ہے۔ اس کی خبر مُنْفَطِرَةٌ مؤنث کے بجائے مذکر مُنْفَطِرٌ آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں اَلسَّمَآءُ عام طور پر مؤنث استعمال ہوتا ہے لیکن چند قبیلے اس کو مذکر استعمال کرتے ہیں۔ اس لیے عربی میں اس کا مؤنث اور مذکر، دونوں استعمال درست مانا جاتا ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے لکھنؤ والے دہی کو کھٹی کہتے ہیں اور دہلی والے کھٹا کہتے ہیں۔ دونوں اہل زبان ہیں۔ اس لیے اردو میں دہی کا مذکر اور مؤنث دونوں استعمال درست مانا جاتا ہے۔

ترجمہ

يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۙ①	قُمِ الَّيْلَ	اِلَّا قَلِيْلًا ۙ②	نِّصْفَهٗٓ
اے کپڑا لپیٹنے والے	آپؐ کھڑے رہیں رات کے وقت	سوائے تھوڑے (وقت) کے	جو اس (رات) کا آدھا ہے

اَوِ انْقُصْ	مِنْهُ قَلِيْلًا ۙ③	اَوْ زِدْ عَلَيْهِ
یا آپؐ (چاہیں تو) گھٹائیں	اس (نصف) میں سے تھوڑا سا	یا آپؐ (چاہیں تو) زیادہ کریں اس (نصف) پر

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ	تَرْتِيْلًا ۭ④	اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ	قَوْلًا ثَقِيْلًا ⑤
اور آپؐ ترتیل سے پڑھیں قرآن کو	جیسا ترتیل کا حق ہے	بیشک ہم ڈالیں گے آپؐ پر	ایک وزنی قول

اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ	هِيَ اَشَدُّ	وَطْاً	وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ⑥	اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ
بیشک رات کا سو کر اٹھنا	یہ زیادہ سخت ہے	بلحاظ پامال کرنے کے	اور زیادہ سیدھی ہے بلحاظ بات کے	بیشک آپؐ کے لیے دن میں

سَبْحًا طَوِيْلًا ۭ⑦	وَاذْكُرِ	اسْمَ رَبِّكَ	وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ	تَبْتِيْلًا ۭ⑧
طویل مصروفیت ہے	اور آپؐ ذکر کریں	اپنے رب کے نام کا	اور سب سے الگ ہو کر آپؐ لو لگائیں	جیسا مسلسل الگ کیے جانے کا حق ہے

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ	لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	فَاتَّخِذْهُ	وَكِيْلًا ⑨
وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے	کوئی الٰہ نہیں سوائے اس کے	تو آپ! بنائیں اس کو	کام (بگڑی) بنانے والا

وَاصْبِرْ عَلٰي مَا	يَقُوْلُوْنَ	وَاهْجُرْهُمْ	هَجْرًا جَمِيْلًا ⑩	وَذَرْنِيْ
اور آپؐ صبر کریں اس پر جو	یہ لوگ کہتے ہیں	اور آپؐ چھوڑ دیں ان کو	جیسا خوبصورتی سے چھوڑنے کا حق ہے	اور آپؐ چھوڑیں مجھ کو

وَالْمُكَذِّبِيْنَ	اُولِي النَّعْمَةِ	وَمَهِّلْهُمْ	قَلِيْلًا ⑪	اِنَّ لَدَيْنَآ اَنْكَالًا
اور ان جھٹلانے والوں کو	جو خوشحالی والے ہیں	اور آپؐ ڈھیل دیں ان کو	تھوڑی سی	بیشک ہمارے پاس بیڑیاں ہیں

وَّجَحِيْمًا ۙ⑫	وَّطَعَامًا	ذَا غُصَّةٍ	وَّعَذَابًا اَلِيْمًا ۙ⑬	يَوْمَ تَرْجُفُ
اور دہکتی آگ ہے	اور ایک ایسا کھانا ہے جو	گلے میں اٹکنے والا ہے	اور ایک دردناک عذاب ہے	جس دن کانپے گی

الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ	وَكَانَتِ الْجِبَالُ	كَثِيْبًا مَّهِيْلًا ⑭	اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ
یہ زمین اور سارے پہاڑ	اور ہو جائیں گے پہاڑ	بھربھری ریت کا ٹیلہ	بیشک ہم نے بھیجا تم لوگوں کی طرف

رَسُوۡلًا ۬ۙ شَاهِدًا عَلَيۡكُمۡ	كَمَاۤ اَرۡسَلۡنَاۤ	اِلٰى فِرۡعَوۡنَ رَسُوۡلًا ؕ﴿۱۵﴾	فَعَصٰى فِرۡعَوۡنُ الرَّسُوۡلَ
ایک ایسا رسول جو گواہی دینے والا ہے تم لوگوں پر	جیسے کہ ہم نے بھیجا	فرعون کی طرف ایک رسول	پھر نافرمانی کی فرعون نے اُن رسولؑ کی

فَاَخَذۡنٰهُ اَخۡذًا وَّبِيۡلًا ﴿۱۶﴾	فَكَيۡفَ تَتَّقُوۡنَ	اِنۡ كَفَرۡتُمۡ	يَوۡمًا
تو ہم نے پکڑا اس کو ایک سخت پکڑ میں	پھر تم لوگ کیسے بچو گے	اگر تم نے انکار کیا	ایک ایسے دن سے جو

يَّجۡعَلُ الۡوِلۡدَانَ	شِيۡبَا ۖ ﴿۱۷﴾	اۨلسَّمَآءُ مُنۡفَطِرٌۢ بِهٖ ؕ	كَانَ وَعۡدُهٗ
بنادے گا بچوں کو	بوڑھا	آسمان پھٹنے والا ہے اس (دن) میں	اس کا وعدہ ہے

مَفۡعُوۡلًا ﴿۱۸﴾	اِنَّ هٰذِهٖ تَذۡكِرَةٌ ۚ	فَمَنۡ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ	سَبِيۡلًا ﴿۱۹﴾
کیا ہوا	بیشک یہ ایک یاددہانی ہے	پھر جو چاہے	وہ بنائے اپنے رب کی طرف	ایک راستہ

نوٹ:1

ترتیل کا مطلب یہ ہے کہ تیز تیز رواں دواں مت پڑھو بلکہ آہستہ آہستہ ایک ایک لفظ زبان سے ادا کرو اور ایک ایک آیت پر ٹھہرو تا کہ ذہن پوری طرح کلام الٰہی کے مفہوم و مدعا کو سمجھے اور اس کے مضامین سے متاثر ہو۔ کہیں اللہ کی ذات و صفات کا ذکر ہے تو اس کی عظمت دل پر طاری ہو۔ کہیں اس کی رحمت کا ذکر ہے تو دل جذباتِ تشکر سے لبریز ہو جائے۔ کہیں عذاب کا ذکر ہے تو دل پر اس کا خوف طاری ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرأت کا طریقہ حضرت انسؓ سے پوچھا گیا تو انہوں نے کہا کہ آپؐ الفاظ کو کھینچ کر پڑھتے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے بتایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایک آیت کو الگ الگ پڑھتے اور ہر آیت پر ٹھہرتے جاتے تھے۔ مثلاً اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۙ﴿۱﴾ پڑھ کر رک جاتے، پھر الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۙ﴿۲﴾ پر ٹھہرتے اور اس کے بعد رک کر مٰلِكِ يَوۡمِ الدِّيۡنِ ؕ﴿۳﴾ کہتے۔ حضرت حذیفہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں رات کی نماز میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کھڑا ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قراءت کا یہ انداز دیکھا کہ جہاں تسبیح کا موقع آتا وہاں تسبیح فرماتے، جہاں دعا کا موقع آتا وہاں دعا مانگتے۔ (تفہیم القرآن)۔

ترتیل میں تحسین صوت یعنی بقدر اختیار خوش آوازی سے پڑھنا بھی شامل ہے۔ (معارف القرآن)۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن لحن اور لَے سے پڑھتے تھے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔5۔ میں اس عظیم مقصد کی طرف اشارہ ہے جس کے لیے قیام لیل کی یہ ہدایت دی گئی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ہم تم پر ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس بھاری بات کے تحمل کے لیے ایک پیشگی ریاضت اور تیاری کے طور پر یہ حکم ہوا، اس بھاری بات سے کیا مراد ہے، اس کے جواب میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ زیادہ قرین قیاس رائے یہ ہے کہ اس سے مراد انذارِ عام ہے جس کا حکم اگلی سورہ میں قُمۡ فَاَنۡذِرۡ ۖ﴿۲﴾ اور اس کے بعد جہادِ عظیم کی تیاری کے لیے دیا گیا جس سے آپؐ کو صحابہ کرامؓ کو اقامت دین کی راہ میں سابقہ پیش آنے والا تھا۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کی یہی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو اس کو دوسری تمام تحریکات سے ممتاز کرتی ہے۔ اس کے لیے دوسرے وسائل و ذرائع کے فراہم ہونے سے پہلے معرفتِ رب، مستحکم ایمان، غیر متزلزل ایمان اور اپنے رب پر کامل اعتماد و توکل ضروری ہے۔ ان اوصاف کے حصول کا واحد ذریعہ نماز، اور بالخصوص شب کی نماز ہے۔ اسی چٹان پر اقامتِ دین کی جدوجہد کی بنیاد ہے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ: 3

چھوڑنا دو طرح کا ہوتا ہے۔ایک چھوڑنا تو وہ ہے جو لعن طعن کے بعد فساد و انتقام کے جذبے کے ساتھ ہو اس طرح کا چھوڑنا عام دنیاداروں کا شیوہ ہے۔انبیاء و صالحین یہ شیوہ اختیار نہیں کرتے۔وہ خلق کی اصلاح کی کوشش اپنی کسی ذاتی منفعت کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی ہدایت اور اللہ کی رضا کے لیے کرتے ہیں۔لوگ ان کی دل آزاری اور ناقدری کرتے ہیں تو انہیں غصہ یا نفرت کے بجائے ان کی محرومی اور بدانجامی پر صدقہ ہوتا ہے۔وہ ان کے رویہ سے مجبور ہو کر ان کو چھوڑتے تو ہیں لیکن یہ چھوڑنا اسی طرح کا ہوتا ہے جس طرح ایک شریف باپ اپنے نالائق بیٹے کے رویہ پر خاموشی اور علیحدگی اختیار کر لیتا ہے۔اس طرح کے چھوڑنے کو یہاں هَجْرًا جَمِيْلًا سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔اس طرح کی علیحدگی بعض اوقات مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔جن کے اندر خیر کی کوئی رمق ہوتی ہے وہ اس شریفانہ طرز عمل سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے رویہ کا جائزہ لینے کی طرف مائل ہوتے ہیں۔(تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (20)

ترکیب

ثُلُثَيْ دراصل ثُلُثَانِ تھا۔اس پر مِنْ داخل ہوا تو یہ حالت جر میں ثُلُثَيْنِ ہو گیا۔پھر یہ اَلَّيْل کا مضاف بنا تو نون اعرابی گر گیا اور یہ ثُلُثَيْ استعمال ہوا۔نِصْفَهٗ اور ثُلُثَهٗ ظرف ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں اور ان کی ہٗ کی ضمیریں اَلَّيْلِ کے لیے ہیں۔تُحْصُوْهُ میں ہٗ کی ضمیر قِيَامُ الَّيْل کے لیے ہے۔اَنْ مضارع کو نصب دیتا ہے لیکن اگر مضارع پر س آجائے تو پھر اَنْ کا عمل ساقط ہو جاتا ہے۔اس لیے اَنْ سَيَكُوْنُ آیا ہے۔مَا تُقَدِّمُوْا کا مَا شرطیہ ہے۔اس لیے تُقَدِّمُوْا مجزوم ہوا ہے۔جبکہ تَجِدُوْا جواب شرط ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے۔خَيْرًا اور اَعْظَمَ کی نصب حال ہونے کی وجہ سے ہے۔

ترجمہ

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ	اَنَّكَ تَقُوْمُ	اَدْنٰى	مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ
بیشک آپ کا رب جانتا ہے	کہ آپ کھڑے ہوتے ہیں	زیادہ قریب (تقریباً)	رات کے دو تہائی میں سے

وَنِصْفَهٗ	وَثُلُثَهٗ	وَطَآئِفَةٌ	مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ؕ
اور (بھی) اس کے آدھے وقت	اور (کبھی) اس کے ایک تہائی وقت	اور ایک گروہ (بھی)	ان لوگوں میں سے جو آپ کے ساتھ ہیں

وَاللّٰهُ يُقَدِّرُ	الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ؕ	عَلِمَ اَنْ لَّنْ تُحْصُوْهُ
اور اللہ اندازہ مقرر کرتا ہے	رات کا اور دن کا	اس نے جانا کہ تم لوگ ہرگز نہ نباہ سکو گے اس (قیام الیل) کو

فَتَابَ عَلَيْكُمْ	فَاقْرَءُوْا	مَا تَيَسَّرَ	مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ
تو اس نے شفقت کی تم پر	پس تم لوگ قرأت کرو	اتنی جتنی آسان ہو	قرآن میں سے

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ	مِنْكُمْ مَّرْضٰى ۙ	وَاٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ	يَبْتَغُوْنَ
اس نے جانا کہ ہوں گے	تم میں سے کچھ مریض	اور کچھ دوسرے سفر کریں گے زمین میں	تلاش کرتے ہوئے

مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ ۙ	وَاٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ	فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۖ	فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ ۙ
اللہ کے فضل میں سے (روزی)	اور کچھ دوسرے قتال کریں گے	اللہ کی راہ میں	تو قرأت کرو اتنی جتنی آسان ہو اس میں سے

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ	وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ	وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ	قَرْضًا حَسَنًا ؕ	وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ
اور قائم کرو نماز کو	اور پہنچاؤ زکوٰۃ کو	اور قرض دو اللہ کو	ایک خوبصورت قرضہ	اور جو تم لوگ آگے بھیجو گے اپنے آپ کے لیے

مِّنۡ خَيۡرٍ	تَجِدُوۡهُ	عِنۡدَ اللّٰهِ	هُوَ خَيۡرًا	وَّاَعۡظَمَ اَجۡرًا ؕ
کوئی بھی نیکی	تو تم لوگ پاؤ گے اس کو	اللہ کے پاس	وہ بہترین ہوتے ہوئے	اور عظیم ہوتے ہوئے بلحاظ اجر کے

وَاسۡتَغۡفِرُوا اللّٰهَ ؕ	اِنَّ اللّٰهَ	غَفُوۡرٌ	رَّحِيۡمٌ ﴿۲۰﴾ ع
اور مغفرت مانگو اللہ سے	بیشک اللہ	بے انتہا بخشنے والا	ہمیشہ رحم کرنے والا ہے

نوٹ: 1

یہ آیت جس کے ذریعہ نماز تہجد کی فرضیت منسوخ ہوئی، شروع سورت کی آیات سے ایک سال یا آٹھ ماہ بعد نازل ہوئی ہے۔ مسند احمد، مسلم، ابوداؤد، ابن ماجہ اور نسائی میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ اس سورت کے شروع میں قیام اللیل کو فرض کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ اس کی پابندی کرتے رہے۔ سورت کا آخری حصہ اللہ تعالیٰ نے آسمان میں روک رکھا۔ سال بھر کے بعد آخری حصہ نازل ہوا جس میں قیام اللیل کی فرضیت منسوخ ہو کر تخفیف ہوگئی اور اس کے بعد قیام اللیل صرف نفل و مستحب رہ گیا۔ (معارف القرآن)۔

تفہیم القرآن میں اس رائے سے اختلاف کیا گیا ہے کہ یہ آخری آیت سورت کے نزول کے ایک سال بعد مکہ میں نازل ہوئی۔ صاحبِ تفہیم کی رائے ہے کہ یہ آخری آیت سورت کے نزول کے دس سال بعد مدینہ میں نازل ہوئی۔ اس کی سند میں ایک تابعی حضرت سعید بن جبیرؒ کا قول نقل کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ ''پہلے رکوع کا مضمون صاف بتا رہا ہے کہ وہ مکہ معظّمہ میں نازل ہوا ہے۔ اور وہاں بھی اس کا نزول ابتدائی دور میں ہوا ہے جبکہ حضور ﷺ کی نبوت کا آغاز ہونے پر زیادہ سے زیادہ چار سال گزرے ہوں گے۔ بخلاف اس کے یہ دوسرا رکوع اپنے مضامین کی صریح شہادت کے مطابق مدینہ کا نازل شدہ معلوم ہوتا ہے، جب کفار سے جنگ کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور زکوٰۃ کی فرضیت کا حکم بھی آ چکا تھا۔''

لیکن میرا ذہن اس دلیل کو قبول کرنے سے معذور ہے۔ اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے میرا ذہن اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بی بی عائشہ صدیقہؓ اور حضرت عباسؓ کے اقوال میں اور اس آیت کے مضامین میں کوئی بُعد یا تضاد نہیں ہے۔ میں اپنی رائے نقل کر رہا ہوں تا کہ امانت ادا ہو جائے۔

سورۃ المزمل کے پہلے رکوع کے نزول کے لگ بھگ ایک سال بعد جب یہ آیت نازل ہوئی ہے، اس وقت صورتحال یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ آدھی آدھی رات، ایک ایک تہائی رات اور کبھی دو تہائی رات عبادت میں گزار کر قیام اللیل کے حکم کو نباہ رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بات کا آغاز ہی اسی صورتحال کی تحسین سے کیا ہے۔ اور پھر اس حکم میں تخفیف کی وجہ بیان کی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس تخفیف کی بنیاد نہ کسی ایسی صورتحال پر تھی جو اس وقت موجود تھی اور نہ کسی ایسے واقعہ پر تھی جو وقوع پذیر ہو چکا تھا بلکہ اس کی بنیاد ایسے حالات و واقعات پر تھی جو مستقبل میں پیش آنے والے تھے اور اللہ کو ان کا علم تھا۔ اس بات کو ذہن میں رکھ کر جب ہم آیت کا مطالعہ کرتے ہیں تو کسی ابہام کے بغیر بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ تم لوگ قیام اللیل کے فرض کو ابھی تو نباہ رہے ہو لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آگے چل کر تم لوگ اسے ہرگز نہ نباہ سکو گے۔ اس لیے اس حکم کی فرضیت ختم ہے۔ اس کا نعم البدل یہ ہے کہ تلاوتِ قرآن کا اہتمام کرو۔ جو لوگ رات میں عبادت کے لیے جاگیں ان کے لیے اب نصف شب کے لگ بھگ عبادت کرنا ضروری نہیں ہے۔ جو جتنی دیر آسانی سے عبادت کر سکے اور تلاوت کر سکے وہ کر لے۔ اور جو لوگ رات میں جاگ نہیں سکتے وہ دن میں تلاوت کا خصوصی اہتمام کریں۔

اس کے بعد اُن چند وجوہات کا ذکر ہے جن کی وجہ سے یہ تخفیف کا حکم دیا گیا تھا۔ اس میں نوٹ کرنے والی بات یہ ہے کہ بات کا آغاز اَنْ یَّکُوْنَ سے نہیں کیا گیا، کیونکہ اس میں حال اور مستقبل دونوں کے معنی ہیں۔ اس کے بجائے بات کا آغاز اَنْ سَیَکُوْنُ سے کیا گیا تا کہ حال کے معنی ختم ہو جائیں۔ اس لیے آیت کے متعلقہ جز کے معنی اب یہ نہیں رہے کہ تم میں کچھ مریض ہو جاتے ہیں کچھ تجارتی سفر کرتے ہیں اور کچھ قتال کرتے ہیں، بلکہ اب معنی صرف یہ رہ گئے کہ تم میں کچھ مریض ہو جائیں گے، کچھ تجارتی سفر کریں گے اور کچھ قتال کریں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آگے چل کر پیش آنے والے ایسے حالات کے پیش نظر یہ حکم اتارا گیا تھا۔ واضح رہے کہ اس آیت کے نزول کے وقت بھی لوگ بیمار پڑتے تھے لیکن اس وقت لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ جیسے جیسے انسان مہذب ہوتا جائے گا، اُس کے جسمانی نظام کی قوت مدافعت کمزور ہوتی جائے گی اور نت نئے امراض کا اضافہ ہوتا رہے گا۔ البتہ اللہ جانتا تھا۔ اس وقت بھی صحابۂ کرامؓ معاشی اور تجارتی کام کرتے تھے لیکن قریش کے تجارتی قافلوں میں ان کی عدم شمولیت کی وجہ سے ان کے تجارتی سفر نہ ہونے کے برابر رہ گئے تھے۔ اور ان کو یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ صورتحال کبھی تبدیل ہوگی۔ لیکن اللہ جانتا تھا کہ نہ صرف ان کے تجارتی اسفار میں اضافہ ہونے والا ہے بلکہ ایک وقت وہ بھی آنے والا ہے جب اہل ایمان اندلس سے انڈونیشیا تک، یعنی اس وقت کی معلوم دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک تجارتی سفر کریں گے۔ اس وقت صحابۂ کرامؓ کو قتال کرنے کی اجازت نہیں تھی لیکن اللہ جانتا تھا کہ نہ صرف قتال کی اجازت دی جائے گی بلکہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب قتال فرض قرار دیا جائے گا۔ اس طرح مستقبل کی صورت حال کی طرف اشارے کر کے صحابۂ کرامؓ کو تسلی بھی دی گئی اور ان کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ مستقبل کے یہ حالات ایسے یقینی ہیں کہ ان کی وجہ سے تخفیف کا حکم بھی نازل کیا جا رہا ہے۔

اس آیت کے زمانۂ نزول کے متعلق بی بی عائشہ صدیقہؓ اور ابن عباسؓ کے اقوال پر شک کرنے کی دوسری وجہ آیت کا اگلا حصہ ہے جس میں مستقبل کی طرف اشارے کرنے کے بعد پھر قیام اللیل کے نعم البدل یعنی تلاوت قرآن کے ذکر کے ساتھ ہدایت دی گئی کہ نماز قائم رکھو، زکوٰۃ پہنچاتے رہو اور اللہ کو قرضِ حسنہ دیتے رہو۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نماز معراج میں اور زکوٰۃ ہجرت کے بعد فرض ہوئی ہے اس لیے یہ آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے۔ لیکن یہ دلیل بھی قابل قبول نہیں ہے۔ معراج میں پانچ وقت کی نمازیں اپنے اوقات کے تعین کے ساتھ فرض ہوئی ہیں لیکن نماز کی ہدایت اس سے پہلے سے موجود تھی۔ مکی صورتوں میں جگہ جگہ واضح الفاظ میں یہ ہدایت موجود ہے۔ بات کو سمجھنے کے لیے اِن شاء اللہ ایک ہی آیت کا حوالہ کافی ہوگا۔ سورہ ھود کی آیت۔ 114۔ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''اور آپؐ قائم رکھیں نماز کو دن کے دونوں کناروں پر اور کچھ حصّوں میں رات میں سے۔'' آیت کے اس جز کی تشریح تفہیم القرآن میں ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ دن کے دونوں سروں پر سے مراد صبح اور مغرب اور کچھ رات گزرنے پر سے مراد عشاء کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ ارشاد اس زمانے کا ہے جب نماز کے لیے ابھی پانچ وقت مقرر نہیں کیے گئے تھے۔ معراج کا واقعہ اس کے بعد پیش آیا جس میں پنج وقتہ نماز فرض ہوئی۔'' اب کوئی ابہام نہیں رہتا کہ آیت زیر مطالعہ میں اس وقت کی ہدایت کے مطابق نماز قائم کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔

اسی طرح سے زکوٰۃ کے قواعد وضوابط کو آخری شکل یقیناً مدینہ میں دی گئی ہے لیکن زکوٰۃ کا حکم پہلے سے موجود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مکی سورتوں میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ مثلاً سورۃ المؤمنون کی پہلی گیارہ آیات میں مومنوں کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ ان میں سے آیت نمبر۔ 4۔ میں ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ پر عمل پیرا ہیں۔ اس کی تشریح میں ''ابن کثیر اور دیگر مفسرین کا کہنا ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت مکہ ہی میں ہو چکی تھی۔ مگر سرکاری طور پر اس کے وصول کرنے کا انتظام اور نصابات وغیرہ کی تفصیلات مدینہ جانے کے بعد جاری ہوئیں۔'' (معارف القرآن)

ان وجوہات کی بنا پر میرا ذہن اس پر آمادہ نہیں ہوتا کہ جلیل القدر صحابۂ کرام کے اقوال کو چھوڑ کر ایک تابعیؒ کے قول 6940 کو ترجیح دی جائے، اور وہ بھی آیات کے زمانۂ نزول کے بارے میں۔

نوٹ:2 مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا وہ تمہارے لیے اس سے زیادہ نفع بخش ہے جو تم نے دنیا میں روک رکھا اور کسی بھلائی کے کام میں اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کیا۔ ایک مرتبہ رسول اللہؐ نے پوچھا تم میں سے کون ہے جس کو اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جسے اپنا مال اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبوب نہ ہو۔ فرمایا سوچ لو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ لوگوں نے عرض کیا کہ ہمارا حال واقعی یہی ہے۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ تمہارا اپنا مال تو وہ ہے جو تم نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیج دیا اور جو کچھ تم نے روک کر رکھا وہ تو وارث کا مال ہے۔ (تفہیم القرآن)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ (74)

آیت نمبر (1 تا 7)

د	ث	ر

(ن) دُثُوْرًا کپڑے کا میلا ہونا۔ بڑھاپے کے آثار ظاہر ہونا۔

(تفعل) تَدَثُّرًا۔ اِدَّثَّرَا۔ کپڑا اوڑھنا۔ کپڑے میں لپٹنا۔

مُدَّثِّرٌ اسم الفاعل ہے۔ کپڑے میں لپٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔1۔

ترجمہ

يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ﴿۱﴾	قُمْ فَاَنْذِرْ ۙ﴿۲﴾
اے کپڑے میں لپٹنے والے	آپؐ کھڑے ہوں پھر آپ خبردار کریں (لوگوں کو)
وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۙ﴿۳﴾	وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۙ﴿۴﴾
اور اپنے رب کی پھر آپؐ بڑائی بیان کریں	اور اپنے کپڑوں کو پھر آپؐ پاک رکھیں
وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ ۙ﴿۵﴾	وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۙ﴿۶﴾
اور گندگی کو پس آپؐ چھوڑ دیں	اور آپؐ احسان کریں کثرت (بہت معاوضہ) چاہتے ہوئے
وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۭ﴿۷﴾	
اور اپنے رب کے لیے پھر آپؐ ثابت قدم رہیں	

نوٹ:1 آیت۔3۔ میں حکم دیا گیا کہ صرف اپنے رب کی بڑائی بیان کیجئے، قول سے بھی اور عمل سے بھی۔ اس جگہ لفظ رب اس لیے اختیار کیا گیا کہ یہ اس

حکم کی علت ہے کیونکہ جو سارے جہان کا پالنے والا ہے صرف وہی ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے (معارف القرآن) انبیاء علیہم السلام کی 6940
دعوت میں توحید کو بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے یعنی صرف اللہ ہی کی کبریائی و یکتائی کا اعلان کہ اللہ کے سوا جو بھی کبریائی کے مدعی ہیں یا جن کی کبریائی کا دعوٰی کیا جاتا ہے، وہ سب باطل ہیں۔ ایک جاہلی معاشرہ میں یہ اعلان ساری خدائی سے لڑائی مول لینے کے ہم معنی تھا لیکن دین کی بنیاد چونکہ اسی کلمہ پر ہے اس لیے ہر نبی کو بے رنگ یہ اعلان کرنا پڑا۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2

وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۔ یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ ان کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو، کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہؐ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا اور حضورؐ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضورؐ نے نوع انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہل عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے، حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو لفظ ''طہارت'' کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے۔

ان الفاظ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو، اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے پہن لیتا تو سمجھا جاتا کہ وہ دنیادار انسان ہے۔ اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی پاکیزہ اور نفیس ہو۔ تیسرا مفہوم یہ ہے کہ لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو یعنی لباس صاف ستھرا تو ضرور ہو لیکن اس میں فخر و غرور، شان و شوکت اور نمائش کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔

چوتھا مفہوم یہ ہی کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ متعدد اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:3

رُجْزَ ۔ رِجْزٌ ۔ اور رِجْسٌ تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس کا استعمال اُس گندگی کے لیے ہوتا ہے جس کو دیکھ کر طبیعت میں ارتعاش اور گھن پیدا ہو۔ یوں تو اس سے ہر قسم کی گندگی مراد ہو سکتی ہے لیکن یہاں یہ خاص طور پر شرک کی گندگی کے لیے آیا ہے کہ اپنے دامن کو شرک کے چھینٹوں سے محفوظ رکھنے کے لیے شرک کی ناپاکی سے دور رہو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس لیے نہیں تھی کہ العیاذ باللہ آپؐ کے کسی شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ تھا۔ مقصود صرف کفار و مشرکین کو آگاہ کرنا تھا کہ وہ جان لیں کہ جو خبردار کرنے والا ان کے پاس آیا ہے اس کا موقف ان کے دینِ شرک کے بارے میں کیا ہے اور وہ اپنے رب کی طرف سے اس باب میں کن ہدایات کے ساتھ مبعوث ہوا ہے (تدبر قرآن)

آیت نمبر (8تا25)

6940

ع ب س

(ض) عَبَسًا ترش روئی کرنا۔ تیوری چڑھائی۔ زیر مطالعہ آیت۔22۔

(ض) عَبُوْسٌ فَعُوْلٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔ صفت کے طور پر آتا ہے۔ انتہائی ترش بدمزاج۔ ﴿اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا ۝١٠﴾ (76/الدھر:10) ''بیشک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے ایک ایسے دن سے جو انتہائی ترش، بہت شدید ہے۔''

ب س ر

(ن) بُسُوْرًا (۱) منہ بگاڑنا۔ منہ بسورنا۔ (مایوسی سے)۔ (۲) چہرے کا اداس ہونا۔ چہرے کا مرجھانا۔ زیر مطالعہ آیت۔22۔

بَاسِرَةٌ اسم الفاعل بَاسِرٌ کا مؤنث ہے۔ اداس ہونے والا۔ مرجھانے والا۔ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍۭ بَاسِرَةٌ ۝٢٤﴾ (75/القیامۃ:24) ''کچھ چہرے اس دن مرجھانے والے ہیں۔''

ترکیب

(آیت۔9۔10) فَذٰلِكَ کا اشارہ گزشتہ آیت میں اِذَا نُقِرَ کی طرف ہے۔ يَوْمَئِذٍ نکرہ مخصوصہ ہے۔ يَوْمٌ عَسِيْرٌ (مرکب توصیفی) اور غَيْرُ يَسِيْرٍ (مرکب اضافی) دونوں اس کی خصوصیت ہیں۔ (آیت۔ 11) ذَرْ فعل امر کا مفعول نِیْ کی ضمیر ہے اور مَنْ خَلَقْتُ کا مفعول مقدم ہے۔ جبکہ وَحِيْدًا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اس کو خَلَقْتُ کی ضمیر فاعلی کا حال بھی مانا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں مطلب ہوگا کہ میں نے تنہا اس کو پیدا کیا۔ اس کام میں کوئی بھی میرا شریک نہیں اور اس کو مَنْ کا حال مانا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کے دو مطلب ہوں گے۔ ایک یہ کہ ہر انسان (مَنْ واحد۔ جمع۔ مذکر۔ مؤنث سب کے لیے آتا ہے) ماں کے پیٹ سے اکیلا آتا ہے۔ مال و اولاد اور دیگر ساز و سامان ساتھ نہیں لاتا۔ دوسرا یہ کہ اس کو اپنے ماں باپ کا اکلوتا پیدا کیا، (آیت۔12۔13) جَعَلْتُ کا مفعول مَالًا اور بَنِيْنَ ہے۔ شُهُوْدًا کو جَعَلْتُ کا تیسرا مفعول بھی مانا جا سکتا ہے ایسی صورت میں مطلب ہوگا موقع پر حاضر رہنے والے یعنی نوکر چاکر، اور اس کو بَنِيْنَ کا حال بھی مانا جا سکتا ہے۔ (حافظ احمد یار صاحب)۔ ہماری رائے ہے کہ چونکہ بَنِيْنَ اور شُهُوْدًا کے درمیان واؤ عاطفہ نہیں ہے اس لیے بہتر ہے کہ شُهُوْدًا کو بَنِيْنَ کا حال مانا جائے۔

ترجمہ

فَاِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ ۝٨	فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ	يَّوْمٌ عَسِيْرٌ ۝٩
پھر جب پھونکا جائے گا بگل میں	تو وہ (واقعہ) ایسے دن ہوگا جو	ایک دشوار دن ہے

عَلَى الْكٰفِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ ۝١٠	ذَرْنِيْ	وَمَنْ	خَلَقْتُ وَحِيْدًا ۝١١
کافروں پر کسی نرمی کے بغیر ہے	آپ چھوڑ دیں مجھ کو	اور اس کو جس کو	میں نے پیدا کیا تنہا ہوتے ہوئے

وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ۝١٢	وَّبَنِيْنَ شُهُوْدًا ۝١٣	وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ	تَمْهِيْدًا ۝١٤
اور میں نے بنایا اس کے لیے بڑھایا ہوا مال	اور بیٹے حاضر رہنے والے	اور میں نے ہموار کیا اس کے لیے (راہوں کو)	جیسے ہموار کرتے ہیں

ثُمَّ يَطْمَعُ	اَنْ اَزِيْدَ ﴿۱۵﴾	كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ	لِاٰيٰتِنَا عَنِيْدًا ﴿۱۶﴾
پھر وہ لالچ کرتا ہے	کہ میں زیادہ کروں	ہرگز نہیں! بیشک وہ تھا	ہماری آیتوں کی مخالفت کرنے والا

سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾	اِنَّهٗ فَكَّرَ	وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾
میں مبتلا کروں گا اس کو ایک دشوار چڑھائی میں	بیشک اس نے غور وفکر کیا	اور قدر و قیمت طے کی

فَقُتِلَ	كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾	ثُمَّ
تو مارا جائے (ستیاناس ہو جائے)	کیسی اس نے قیمت طے کی	پھر (I Repeat)

قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾	ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾	ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾
مارا جائے کیسی اس نے قیمت طے کی	پھر اس نے نظر دوڑائی	پھر اس نے تیوری چڑھائی اور منہ بسورا

ثُمَّ اَدْبَرَ	وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾	فَقَالَ اِنْ هٰذَآ
پھر اس نے پیٹھ پھیری	اور بڑا بنا	تب اس نے کہا نہیں ہے یہ

اِلَّا سِحْرٌ	يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾	اِنْ هٰذَآ اِلَّا	قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾
مگر ایک ایسا جادو جو	نقل کیا جاتا ہے	نہیں ہے یہ مگر	اس بشر کا قول

نوٹ: 1

اس سورۃ میں پہلی سات آیات مکہ معظّمہ کے بالکل ابتدائی دور کی نازل شدہ ہیں۔ سورۃ کا باقی ماندہ حصّہ آیت۔8 سے آخر تک اس وقت نازل ہوا جب اسلام کی علانیہ تبلیغ شروع ہو جانے کے بعد مکہ میں پہلی مرتبہ حج کا موقع آیا۔ اور مکہ کے لوگوں کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ اس موقع پر تمام عرب سے حاجیوں کے قافلے آئیں گے، اگر محمدؐ نے ان قافلوں کی قیام گاہوں پر حاجیوں سے ملاقاتیں کیں اور اجتماعات میں قرآن جیسا مؤثر کلام سنایا تو عرب کے ہر گوشے تک ان کی دعوت پہنچ جائے گی اور نہ معلوم کون کون اس سے متاثر ہو جائے۔ اس لے قریش کے سرداروں نے ایک کانفرنس کی جس میں طے کیا گیا کہ حاجیوں کے آتے ہی ان کے اندر رسول اللہؐ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ اس پر اتفاق رائے ہو گیا تو ولید بن مغیرہ نے حاضرین سے کہا کہ اگر آپ لوگوں نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق مختلف باتیں لوگوں سے کہیں تو ہم سب کا اعتبار جاتا رہے گا۔ اس لیے کوئی ایک بات طے کر لو جسے سب بالا اتفاق کہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم کاہن کہیں گے۔ ولید نے کہا قرآن کو کاہنوں سے دور کی نسبت بھی نہیں ہے۔ کچھ نے کہا انہیں مجنون کہا جائے۔ ولید نے کہا کون باور کرے گا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ دیوانگی کی بڑ ہے یا جنون کے دورے میں آدمی یہ باتیں کر سکتا ہے۔ لوگوں نے کہا اچھا تو پھر ہم شاعر کہیں گے۔ ولید نے کہا کہ ہم شعر کی ساری اقسام سے واقف ہیں۔ اس کلام پر شاعری کی کسی قسم کا اطلاق بھی نہیں ہو سکتا۔ لوگ بولے تو ان کو ساحر کہا جائے۔ ولید نے کہا جادوگر اپنے جادو کے لیے جو طریقے اختیار کرتے ہیں، ان سے بھی ہم واقف ہیں۔ یہ بات بھی ان پر چسپاں نہیں ہوتی۔ پھر ولید نے کہا ان باتوں میں سے جو بات بھی تم کرو گے، لوگ اسے ناروا الزام سمجھیں گے۔ خدا کی قسم اس کلام میں بڑی حلاوت ہے۔ اس کی جڑ بڑی گہری اور اس کی ڈالیاں بڑی ثمر دار ہیں۔ اس پر ابوجہل ولید کے سر ہو گیا اور اس نے کہا تمہاری قوم تم سے راضی نہ ہوگی جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بارے میں

کوئی بات نہ کہو۔اس نے کہا اچھا مجھے سوچ لینے دو۔ پھر سوچ سوچ کر بولا قریب ترین بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ تم عرب کے لوگوں سے کہو یہ شخص جادوگر ہے۔ یہ ایسا کلام پیش کر رہا ہے جو آدمی کو باپ۔ بھائی۔ بیوی۔ بچوں اور سارے خاندان سے جدا کر دیتا ہے۔ ولید کی اس بات کو سب نے قبول کر لیا۔ پھر ایک منصوبہ کے مطابق حج کے زمانے میں قریش کے وجود حاجیوں کے درمیان پھیل گئے اور انھوں نے لوگوں کو خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں ایک ایسا شخص اٹھ کھڑا ہوا ہے جو بڑا جادوگر ہے اور اس کا جادو خاندانوں میں تفریق ڈال دیتا ہے، اس سے ہوشیار رہنا مگر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام خود ہی سارے عرب میں مشہور کر دیا۔ یہی واقعہ ہے جس پر اس سورہ کے دوسرے حصّے یعنی آیت۔8۔ سے آخر تک، میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ (تفہیم القرآن۔ ج6۔ص138 تا140 سے ماخوذ)

آیت نمبر (26 تا 37)

ترکیب

(آیت۔27) سَقَرُ غیر منصرف ہے اور مؤنث سماعی بھی ہے۔ اس لیے آگے مُبْقِیْ۔ تَذَرُ۔ لَوَّاحَۃٌ اس کے لیے مؤنث کے صیغے آئے ہیں اور آگے اس کے لیے ضمیریں بھی مؤنث کی آئی ہیں۔ (آیت۔29) لَوَّاحَۃٌ خبر ہے۔ اس کا مبتدا ھِیَ محذوف ہے۔ لِلْبَشَرِ متعلق خبر ہے اور اس پر لام جنس ہے اس لیے اس کا ترجمہ جمع میں ہوگا۔ (آیت۔30) عَلَیْھَا کی ضمیر سَقَرُ کے لیے ہے۔ (آیت۔31) لِیَسْتَیْقِنَ کے لام کَیْ پر عطف ہونے کی وجہ سے یَزْدَادَ اور یَرْتَابَ، دونوں مضارع حالت نصب میں آئے ہیں کیونکہ لام کَیْ کے بعد اَنْ مقدر ہوتا ہے۔ وَمَاھِیَ ذِکْرٰی میں ھِیَ بھی سَقَرُ کے لیے ہے اور آیت۔ 26۔ سے اس کی جو بات چلی آ رہی ہے اسے ذِکْرٰی کہا ہے۔ (آیت۔35۔36) اِنَّھَا لَاِحْدَی الْکُبَرِ میں اِنَّھَا کی ضمیر بھی سَقَرُ کے لیے ہے اور اَلْکُبَرِ۔ کُبْرٰی کی جمع ہے۔ نَذِیْرًا۔ اِنَّھَا کا حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ فَعِیْلٌ کے وزن پر آنے والے اسماء الصفہ میں کبھی مذکر مؤنث میں فرق کرنے کے لیے تائے تانیث لگاتے ہیں اور کبھی نہیں بھی لگاتے۔ اس لیے یہاں نَذِیْرَۃً کے بجائے نَذِیْرًا بھی درست ہے۔

ترجمہ

سَاُصْلِیْهِ سَقَرَ ﴿٢٦﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا سَقَرُ ﴿٢٧﴾	لَا تُبْقِیْ وَلَا تَذَرُ ﴿٢٨﴾
میں ڈالوں گا اس کو جھلسانے والی (دوزخ) میں	اور آپ کیا جانیں کیا ہے جھلسانے والی	وہ باقی نہیں رہنے دیتی اور نہ چھوڑتی ہے

لَوَّاحَةٌ لِّلْبَشَرِ ﴿٢٩﴾	عَلَیْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ﴿٣٠﴾	وَمَا جَعَلْنَآ	اَصْحٰبَ النَّارِ
جھلسانے والی ہے انسانوں کو	اس پر انیس (فرشتے) ہیں	اور ہم نے نہیں بنایا (کسی کو)	آگ والے (داروغہ)

اِلَّا مَلٰٓئِكَةً	وَّمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ	اِلَّا فِتْنَةً	لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا
مگر کچھ فرشتوں کو	اور ہم نے نہیں بنایا ان کی گنتی کو	مگر ایک آزمائش	ان کے لیے جنھوں نے کفر کیا

لِیَسْتَیْقِنَ الَّذِیْنَ	اُوْتُوا الْكِتٰبَ	وَیَزْدَادَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا	اِیْمَانًا
تاکہ یقین حاصل کریں وہ لوگ جن کو	دی گئی کتاب	اور زیادہ ہوں وہ لوگ جو ایمان لائے	بلحاظ ایمان کے

وَّلَا یَرْتَابَ الَّذِیْنَ	اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ	وَلِیَقُوْلَ الَّذِیْنَ
اور تاکہ شبہہ میں نہ پڑیں وہ لوگ جن کو	دی گئی کتاب اور مومن لوگ	اور تاکہ کہیں وہ لوگ

فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ	وَّالْكٰفِرُوْنَ	مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ	بِهٰذَا مَثَلًا ؕ 6940
جن کے دلوں میں ایک روگ ہے	اور کافر لوگ	کیا ارادہ کیا اللہ نے	اس (گنتی) سے بطور مثال کے

كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ	مَنْ يَّشَآءُ	وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ	وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ
اس طرح پھسلا دیتا ہے اللہ	اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اور وہ ہدایت دیتا ہے اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اور نہیں جانتا آپؐ کے رب کے لشکروں کو (کوئی بھی)

اِلَّا هُوَ ؕ	وَمَا هِيَ	اِلَّا ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ﴿۳۱﴾	كَلَّا وَالْقَمَرِ ۙ ﴿۳۲﴾
مگر وہی	اور نہیں ہے یہ (سقر کی بات)	مگر ایک یاددہانی انسانوں کے لیے	ہرگز نہیں! قسم ہے چاند کی

وَالَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ ۙ ﴿۳۳﴾	وَالصُّبْحِ اِذَآ اَسْفَرَ ۙ ﴿۳۴﴾	اِنَّهَا	لَاِحْدَى الْكُبَرِ ۙ ﴿۳۵﴾
قسم ہے رات کی جب اس نے پیٹھ پھیری	قسم ہے صبح کی جب وہ روشن ہوتی ہے	بیشک یہ (بات)	یقیناً بہت بڑی باتوں کی ایک ہے

نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ ۙ ﴿۳۶﴾	لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ	اَنْ يَّتَقَدَّمَ	اَوْ يَتَاَخَّرَ ؕ ﴿۳۷﴾
خبردار کرنے والی ہوتے ہوئے انسانوں کے لیے	اس کے لیے جو چاہے تم میں سے	کہ وہ آگے بڑھے	یا (چاہے تو) پیچھے رہے

نوٹ:1

آیت۔30۔ میں ہے کہ دوزخ پر انیس فرشتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے دوزخ کے انتظام پر جو فرشتوں کا لشکر ہوگا اس کے افسر انیس فرشتے ہوں گے۔ جن میں سب سے بڑے ذمہ دار کا نام مالک ہے۔ (دیکھیں آیت۔43۔77، نوٹ۔1) حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے نہایت تفصیل سے انیس کے عدد کی حکمتیں بیان کی ہیں جو قابل دید ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جہنم میں مجرموں کو عذاب دینے کے لیے انیس قسم کے فرائض ہیں۔ جن میں سے ہر فرض کی انجام دہی ایک ایک فرشتے کی سرکردگی میں ہوگی۔ کوئی شبہ نہیں کہ فرشتہ کی طاقت بہت بڑی ہے اور ایک فرشتہ وہ کام کرسکتا ہی جو لاکھوں آدمی مل کے نہیں کرسکتے۔ لیکن یاد رہے کہ ہر فرشتے کی یہ قوت اسی دائرے میں محدود ہے جس کام کے کرنے کے لیے وہ مامور ہوا ہے۔ مثلاً ملک الموت لاکھوں آدمیوں کی جان ایک آن میں نکال سکتا ہے۔ مگر عورت کے پیٹ میں ایک بچے کے اندر جان نہیں ڈال سکتا۔ حضرت جبریلؑ چشم زدن میں وحی لا سکتے ہیں لیکن پانی برسانا ان کا کام نہیں ہے۔ جس طرح کان دیکھ نہیں سکتا، آنکھ سن نہیں سکتی۔ اسی طرح اگر ایک فرشتہ عذاب کے واسطے دوزخیوں پر مقرر ہوتا تو اس سے ایک ہی قسم کا عذاب دوزخیوں پر ہوسکتا ہے۔ دوسری قسم کا عذاب جو اس کے دائرہ استعداد سے باہر ہے ممکن نہ تھا۔ اس لیے انیس قسم کے عذابوں کے لیے، جن کی تفصیل تفسیر عزیزی میں ہے، انیس ذمہ دار فرشتے مقرر ہوئے علماء نے اس عدد کی حکمتوں پر بہت کچھ کہا ہے مگر احقر کے نزدیک حضرت شاہ صاحبؒ کا کلام بہت عمیق ولطیف ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:2

اگلی آیت۔31۔ میں دوزخ کے کارکنوں کی تعداد بیان کرنے کی وجہ بیان کرنے کی وجہ بیان کی گئی کہ یہ تعداد اس لئے بیان کی گئی کہ یہ ہر اس شخص کے لیے فتنہ بن جائے جو اپنے اندر کوئی کفر چھپائے بیٹھا ہو۔ اگر وہ خدا کی عظیم قدرتوں کے بارے میں یا وحی ورسالت کے بارے میں شک کا کوئی شائبہ بھی اپنے دل میں رکھتا ہے، تو یہ سنتے ہی کہ خدا کی اتنی بڑی جیل میں بے حد وحساب مجرموں کو صرف 19 سپاہی قابو میں رکھیں گے اور فرداً فرداً ایک ایک شخص کو عذاب بھی دیں گے، تو اس کا کفر فوراً کھل کر باہر آجائے گا۔

دوسری وجہ یہ بتائی گئی کہ اہل کتاب اس سے یقین حاصل کریں گے۔ بعض مفسرین نے اس کا یہ مطلب لیا ہے کہ اہل کتاب کے ہاں چونکہ ان کی کتابوں میں جو دوزخ کے فرشتوں کی یہی تعداد بیان کی گئی ہے اس لیے یہ بات سن کر ان کو یقین آجائے گا کہ یہ

بات فی الواقع اللہ تعالیٰ ہی کی فرمائی ہوئی ہے۔لیکن دو وجوہ سے یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔اوّل یہ کہ یہود و نصاریٰ کی کتابوں میں یہ بات کہیں نہیں ملتی کہ دوزخ کے فرشتوں کی تعداد 19 ہے۔دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جو اہل کتاب کی مذہبی کتابوں میں بھی بیان کی گئی ہیں۔لیکن وہ لوگ اس کی یہ توجیہ کر دیتے ہیں کہ محمدؐ نے یہ باتیں ان کی کتابوں سے نقل کر لی ہیں۔ان وجوہ سے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ میری زبان سے دوزخ کے انیس فرشتوں کا ذکر سنکر میرا خوب مذاق اڑایا جائے گا۔اس کے باوجود بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی وحی میں بیان ہوئی تھی اسے انہوں نے کسی جھجھک کے بغیر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا اور کسی مذاق استھزاء کی پرواہ نہ کی۔جہلائے عرب تو انبیاء کی اس شان سے ناواقف تھے،مگر اہل کتاب خوب جانتے تھے کہ انبیاء کا ہر زمانے میں یہی طریقہ رہا ہے کہ جو کچھ خدا کی طرف سے آتا تھا اسے وہ جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیتے تھے۔اس بنا پر اہل کتاب سے یہ بات زیادہ متوقع تھی کہ رسول اللہؐ کے اس طرز عمل کو دیکھ کر انہیں یقین آجائے گا کہ ایسے سخت مخالف ماحول میں ایسی بظاہر انتہائی عجیب بات کو کسی جھجھک کے بغیر پیش کر دینا ایک نبی ہی کا کام ہوسکتا ہے۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (38 تا 56)

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ	رَهِيْنَةٌ ﴿٣٨﴾	اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ﴿٣٩﴾
ہر جان،اس میں جو اس نے کمائی کی	گروی رکھی ہوئی ہے	سوائے داہنی طرف والوں کے

فِيْ جَنّٰتٍ ۛ يَتَسَآءَلُوْنَ ﴿٤٠﴾	عَنِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿٤١﴾	مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ﴿٤٢﴾
(وہ لوگ) باغات میں ایک دوسرے سے پوچھیں گے	مجرموں کے بارے میں	(پھر مجرموں سے پوچھیں گے) کس چیز نے ڈالا تم کو دوزخ میں

قَالُوْا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ﴿٤٣﴾	وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ	الْمِسْكِيْنَ ﴿٤٤﴾	وَكُنَّا نَخُوْضُ
وہ لوگ کہیں گے ہم نہیں تھے نمازیوں میں سے	اور ہم نہیں کھلایا کرتے تھے	مسکینوں کو	اور ہم لاحاصل بحث کیا کرتے تھے

مَعَ الْخَآئِضِيْنَ ﴿٤٥﴾	وَكُنَّا نُكَذِّبُ	بِيَوْمِ الدِّيْنِ ﴿٤٦﴾	حَتّٰٓى اَتٰىنَا
بحث کرنے والوں کے ساتھ	اور ہم جھٹلایا کرتے تھے	بدلے کے دن کو	یہاں تک کہ آن پہنچا ہمارے پاس

الْيَقِيْنُ ﴿٤٧﴾	فَمَا تَنْفَعُهُمْ	شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾	فَمَا لَهُمْ
وہ یقین (موت)	تو نفع نہیں دے گی ان کو	شفاعت کرنے والوں کی شفاعت	تو انہیں کیا (ہو گیا) ہے

عَنِ التَّذْكِرَةِ مُعْرِضِيْنَ ﴿٤٩﴾	كَاَنَّهُمْ	حُمُرٌ مُّسْتَنْفِرَةٌ ﴿٥٠﴾
(کہ) اس یاددہانی سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں	(ایسے) جیسے کہ وہ لوگ	بدکنے والے ایسے گدھے ہیں جو

فَرَّتْ	مِنْ قَسْوَرَةٍ ﴿٥١﴾	بَلْ يُرِيْدُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	اَنْ يُّؤْتٰى
بھاگے	کسی شیر (شیرانِ خدا کی دہشت) سے	بلکہ چاہتا ہے ہر مردان میں سے	کہ اس کو دیئے جائیں

صُحُفًا مُّنَشَّرَةً ﴿٥٢﴾	كَلَّا ۭ بَلْ لَّا يَخَافُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿٥٣﴾	كَلَّآ اِنَّهٗ تَذْكِرَةٌ ﴿٥٤﴾
کھولے ہوئے اوراق	ہرگز نہیں بلکہ یہ لوگ خوف نہیں محسوس کرتے آخرت کا	ہرگز نہیں بیشک یہ (قرآن) ایک یاددہانی ہے

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهُ ﴿۵۵﴾	وَمَا يَذْكُرُوْنَ	اِلَّآ اَنْ
تو جو چاہے وہ یاد کرے اس کو	اور وہ لوگ یاد نہیں کریں گے	سوائے اس کے کہ

يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ	هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى	وَاَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ﴿۵۶﴾
چاہے اللہ	وہی تقویٰ کیے جانے کا اہل ہے	بخش دینے کا اہل ہے

نوٹ: 1

زیر مطالعہ آیات۔40 تا48۔ میں جن مجرمین کا ذکر ہے ان کے متعلق یہ بات ذہن میں واضح کرلیں کہ یہ ملحدوں یا کافروں کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایسے مسلمانوں کا ذکر ہے جو ایمانیات کو مانتے ہیں اور دل سے مانتے ہیں۔ آخرت کا اقرار کرتے ہیں لیکن دنیاوی معاملات میں الجھتے وقت آخرت میں جوابدہی اور حساب کتاب کا خوف محسوس نہیں کرتے۔ اس طرح آخرت کی تکذیب عملی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے عمل میں کمزور ہیں۔ ٹی۔ وی دیکھ رہے ہیں یا کسی مجلس میں شخصیات پر گرما گرم بحث میں مبتلا ہیں، کسی کی غیبت ہے، کسی پر بہتان ہے یا روزہ رکھا ہوا ہے اور روزہ بہلانے کے لیے کلب میں بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں، ایسے میں اذان کی آواز آجاتی ہے تو جلدی سے اپنا کام روک دیتے ہیں۔ اذان کا جواب دیتے ہیں اذان ختم ہونے کی دعا پڑھ کر منہ پر ہاتھ پھیر کے پھر شروع ہو جاتے ہیں اور نماز پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ البتہ اگر کبھی غیرتِ اسلامی کے مظاہرے کا موقع آجائے تو جلسہ جلوس، مار کٹائی، ڈکیتی اور قتل و غارتگری میں اسلام کی سربلندی کے لیے اس طرح شریک ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود اور رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ہدایات کو پیروں تلے روند کر سمجھتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کی بڑی خدمت کی ہے۔ اسلام کی خاطر ان کی سرفروشی کو دیکھ کر ہمارے جیسے کچے پکے مسلمان ان کو خود سے بہتر مسلمان سمجھتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے اگر معافی دے کر اپنی رحمت سے ہمیں جنت میں بھیج دیا یا رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کے طفیل ہمیں دوزخ سے نکال کر جنت میں پہنچا دیا گیا، تو وہاں ہم ایسے سرفروشوں کو تلاش کریں گے اور ایک دوسرے سے پوچھیں گے کہ وہ جیالے کدھر ہیں، نظر نہیں آتے۔ پھر جب جنت کو چھوڑ کر دوزخ کا جائزہ لیں گے تو وہاں وہ نظر آجائیں گے اور ہم حیران ہو کر پوچھیں گے کہ حضرت آپ یہاں کیسے۔ اس وقت جو مکالمہ ہوگا، آیت۔47۔ تک میں اس کا بیان ہے اور آیت۔48۔ میں ایسے مجرموں کے لیے اللہ تعالیٰ کے حتمی فیصلے کا بیان ہے۔ (مرتب)

وہ جو کہیں گے کہ ہم نمازیوں میں سے نہیں تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان لوگوں میں سے نہ تھے جنہوں نے خدا اور اس کے رسول اور اس کی کتب کو مان کر خدا کا وہ اوّلین حق ادا کیا ہو جو ایک خدا پرست انسان پر عائد ہوتا ہے یعنی نماز۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک وہ ایمان نہ لایا ہو۔ اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے۔ لیکن نمازیوں میں سے نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو۔ (تفہیم القرآن)۔

مجرموں کے جواب کا آخری جملہ بہت اہم ہے جس میں انہوں نے کہا ''یہاں تک کہ آن پہنچا ہمارے پاس وہ یقین''، یعنی موت۔ ایک طرف اس میں حسرت ہے کہ قبل اس کے کہ ہم توبہ کرتے اور اپنی اصلاح کرتے، ہمارا وقت پورا ہو گیا اور ہمیں توبہ کا موقع نہیں ملا۔ دوسری طرف اس میں اس چیز کی طرف اشارہ ہے جو اس عارضی دنیا میں اہل ایمان کا سب سے قیمتی اثاثہ ہے یعنی توبہ کا دروازہ۔ اور ہمارے لیے یہ ہے کہ کوئی پتہ نہیں توبہ کا دروازہ کب بند ہو جائے اس لیے ہر صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً جائزہ لیتا رہے، اپنے اعمال کی اصلاح کرتا رہے اور محض اپنے ایمان کی پونجی کے بھروسے پر مت بیٹھا رہے۔ اس آیت میں موت کو

الیقین اس لیے کہا گیا ہے کہ اس دنیا میں جب انسان کی آنکھ بند ہوتی ہے تو اُس دنیا میں کھل جاتی ہے اور وہاں کی جن جن باتوں کی خبر انسان کو یہاں دی گئی ہے، وہ سب اس کی آنکھوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ اُس وقت اہل ایمان کا علم الیقین، عین الیقین میں ڈھل جاتا ہے اور اُس وقت کٹر سے کٹر ملحد اور کافر بھی یقین لانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس یقین کی وادی کا دروازہ موت ہے۔ (مرتب)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ آخرت میں اللہ کے فرشتے، انبیاء، شہداء اور صالحین گنہگاروں کی شفاعت کریں گے اور وہ ان کی شفاعت سے جہنم سے نکال لیے جائیں گے سوائے ان چار قسم کے مجرمین کے جن کا ذکر یہاں آیا ہے۔ یعنی جو نماز اور زکوٰۃ کے تارک ہیں، جو اہل باطل کی اسلام کے خلاف باتوں میں ان کے شریک رہتے ہیں اور جو قیامت کا انکار کرتے ہیں۔ (معارف القرآن)۔

ہمارے جاننے والے چند اصحاب کو یہ بات تسلیم کرنے میں تردد ہے کہ یہاں نکذب بیوم الدین سے مراد تکذیب عملی ہے جبکہ صورتحال یہ ہے کہ یہاں جتنے بھی جرائم کا ذکر ہے ان سب کا تعلق عمل سے ہے، کسی ایک کا بھی تعلق قول سے نہیں ہے۔ منکر صلوٰۃ اور منکرِ زکوٰۃ مجرم نہیں بلکہ کافر ہے۔ جب کہ تارکِ صلوٰۃ اور تارکِ زکوٰۃ کافر نہیں ہے مجرم ہے۔ جرم یہ ہے کہ وہ زبان سے ان کا اقرار کر رہا ہے اور اپنے عمل سے ان کی تکذیب کر رہا ہے۔ اسی طرح سے جو زبان سے آخرت کا اقرار کرے لیکن اس عقیدے کے عملی تقاضوں کو پورا نہ کرے وہ آخرت کے عقیدے کی عملی تکذیب کا مجرم ہے کافر نہیں ہے۔ ایک مسلمان جب خوض کرنے والوں کے ساتھ خوض کرتا ہے اور زندگی کے دیگر معاملات میں اللہ کی حکم عدولی کرتا ہے، اُس وقت اس کے دل سے آخرت کا خوف نکل چکا ہوا ہے، چاہے زبان سے وہ آخرت کا اقرار کرتا ہو لیکن اپنے عمل سے وہ اس کی تکذیب کرتا ہے۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کا اعترافِ جرم ہے۔ (مرتب)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ القیامۃ (75)

آیت نمبر (1 تا 15)

ترکیب

(آیت۔3) اَلَّنۡ میں ہمزہ استفہام نہیں ہے۔ اگر یہ ہمزۂ استفہام ہوتا تو اَکَنۡ آتا۔ لام پر تشدید بتا رہی ہے کہ یہ دراصل اَنۡ لَّنۡ ہے اور اَنۡ کا نون گرا ہوا ہے۔ قرآن مجید کے اس مقام پر اَنۡ کے نون کو گرا کر لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے، ورنہ عام عربی میں اس کو اَنۡ لَّنۡ ہی لکھتے ہیں البتہ پڑھتے اَلَّنۡ ہیں۔ (آیت۔4) قٰدِرُوۡنَ کے بجائے قٰدِرِیۡنَ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہے۔ اس لیے بَلٰی کے بعد لَنَجۡمَعَنَّ محذوف مانا جاتا ہے۔ اس طرح جملہ کا اصل مفہوم ہے کہ کیوں نہیں! ہم لازماً جمع کریں گے قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ..... (آیت۔ 11) لَا وَزَرَ میں وَزَرَ ماضی کا صیغہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ اسم وَزَرٌ ہے۔ اس پر لائے نَفۡیِ جنس داخل ہونے کی وجہ سے یہ وَزَرَ ہوا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/2)

ترجمہ

لَاۤ اُقۡسِمُ بِیَوۡمِ الۡقِیٰمَۃِ ۙ﴿۱﴾	وَ لَاۤ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ ؕ﴿۲﴾
نہیں میں قسم کھاتا ہوں قیامت کے دن کی	اور نہیں میں قسم کھاتا ہوں بار بار ملامت کرنے والے نفس کی

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَلَّنۡ نَّجۡمَعَ عِظَامَہٗ ؕ﴿۳﴾	بَلٰی	قٰدِرِیۡنَ عَلٰۤی اَنۡ
کیا گمان کرتا ہے انسان کہ ہم ہرگز جمع نہیں کریں گے اس کی ہڈیوں کو	کیوں نہیں (ہم ضرور جمع کریں گے)	قادر ہوتے ہوئے اس پر کہ

نُسَوِّيَ بَنَانَهٗ ④	بَلْ يُرِيْدُ الْاِنْسَانُ	لِيَفْجُرَ اَمَامَهٗ ⑤
ہم درست کر دیں اس کی پور پور کو	بلکہ چاہتا ہے انسان	کہ وہ اپنی مرضی چلائے اپنے آگے (آنے والے وقت میں بھی)

6940

يَسْـَٔلُ اَيَّانَ يَوْمُ الْقِيٰمَةِ ⑥	فَاِذَا بَرِقَ الْبَصَرُ ⑦	وَخَسَفَ الْقَمَرُ ⑧	وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ⑨
وہ پوچھتا ہے کب ہوگا قیامت کا دن	تو جب چندھیا جائے گی آنکھ	اور گہنا جائے گا چاند	اور اکٹھا کیے جائیں گے سورج اور چاند

يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ	اَيْنَ الْمَفَرُّ ⑩	كَلَّا لَا وَزَرَ ⑪
کہے گا انسان اس دن	کدھر ہے بھاگنے کی جگہ	ہرگز نہیں! کوئی بھی پناہ گاہ نہیں ہے

اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَىِٕذِ ۣالْمُسْتَقَرُّ ⑫	يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍۭ	بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ ⑬
تیرے رب کی طرف ہی اس دن ٹھہرنے کا ٹھکانہ ہے	جتلا دیا جائے گا انسان کو اس دن	وہ جو اس نے آگے بھیجا اور (جو) اس نے پیچھے چھوڑا

بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ⑭	وَّلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ ⑮
بلکہ انسان اپنے آپ کو خوب دیکھنے والا ہے	اور اگر چہ وہ ڈالے (پیش کرے) اپنے بہانے

نوٹ:1

یہاں اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن اور ملامت کرنے والے نفس (ضمیر) کی قسم جس بات پر کھائی ہے اسے بیان نہیں کیا گیا کیونکہ بعد کا فقرہ خود اس بات پر دلالت کر رہا ہے۔ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کو مرنے کے بعد دوبارہ ضرور پیدا کرے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس بات پر ان دو چیزوں کی قسم کس مناسبت سے کھائی گئی ہے۔

جہاں تک روزِ قیامت کا تعلق ہے، اس کی قسم کھانے کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات کا نظام اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ یہ نظام نہ ہمیشہ سے تھا اور نہ ہمیشہ باقی رہ سکتا ہے۔ جتنا جتنا اس دنیا کے متعلق انسان کا علم بڑھتا جاتا ہے اتنا ہی یہ امر یقینی ہوتا چلا جاتا ہے کہ اس نظام کی ایک ابتدا ہے جس سے پہلے یہ نہ تھا اور لازماً اس کی ایک انتہا ہے جس کے بعد یہ نہ رہے گا۔ اس بنا پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کے وقوع پر خود قیامت کی ہی قسم کھائی ہے لیکن روزِ قیامت کی قسم صرف اس امر کی دلیل ہے کہ ایک دن یہ نظام کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ رہی یہ بات کہ اس کے بعد انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا اور اس کو اپنے اعمال کا حساب دینا ہوگا، تو اس کے لیے دوسری قسم نفس لوامہ کی کھائی گئی ہے۔ کوئی انسان دنیا میں موجود نہیں ہے جو اپنے اندر ضمیر نام کی ایک چیز نہ رکھتا ہو۔ اس کا ضمیر اسے برائی کرنے اور بھلائی نہ کرنے پر ٹوکتا ضرور ہے۔ یہ اس بات کی صریح دلیل ہے کہ انسان ایک اخلاقی وجود ہے اور وہ خود اپنے آپ کو اپنے اچھے اور بُرے افعال کا ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اب اگر انسان میں نفس لوامہ کی موجودگی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، تو پھر یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ یہی نفس لوامہ زندگی بعدِ موت کی ایک ایسی شہادت ہے جو خود انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ کیونکہ فطرت کا یہ تقاضہ کہ انسان کو اچھے اور برے اعمال کی جزا یا سزا ضرور ملنی چاہیے، زندگی بعد موت کے سوا کسی دوسری صورت میں پورا نہیں ہوسکتا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

نفس لوامہ سے مراد کوئی علیحدہ اور مستقل نفس نہیں ہے بلکہ یہ نفس انسانی ہی کا ایک پہلو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کی تشکیل اس طرح فرمائی ہے کہ اس کے اندر نیکی اور بدی کا شعور ودیعت فرما دیا ہے۔ اور اس کے لیے ضابطہ ٹھہرایا ہے کہ جو اپنے نفس کو برائیوں سے پاک رکھے گا وہ فلاح پانے والا ہے اور جو اس کو برائیوں سے آلودہ رکھے گا وہ نامراد ہوگا۔ سورۃ الشمس میں اس کی طرف یوں اشارہ فرمایا ’’اور گواہ ہے نفس اور اس کی تشکیل۔ پس اس کو الہام کر دی اس کی بدی اور نیکی۔ جس نے اس کو پاک رکھا اس نے فلاح پائی اور جس نے اس کو آلودہ رکھا وہ نامراد ہوا۔‘‘ (آیات۔7۔10)۔ اس تشکیل کی اس نوعیت کے سبب سے نفس بعض اوقات اپنی خواہشوں سے مغلوب ہو کر اپنا توازن کھو بیٹھتا ہے اور وہ انسان کو کسی برائی پر آمادہ کر دیتا ہے۔ نفس کے اس رجحان کو قرآن میں نفس امارہ سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔ (سورہ یوسف۔53) لیکن یہ نفس

نیکیوں کا شعور بھی رکھتا ہے۔ اس وجہ سے جب تک اس کا توازن برقرار رہتا ہے اس وقت تک وہ اپنے آپ کو بھی برائی صادر ہونے پر ملامت کرتا ہے اور دوسروں کی برائیوں کو دیکھ کر بھی کڑھتا ہے اور بسا اوقات ملامت کرتا ہے۔ نفس کے اسی پہلو کو یہاں نفس امارہ 6940 سے تعبیر فرمایا گیا ہے۔

نفس کے توزان کو درست رکھنے کی تدبیر اللہ تعالیٰ نے یہ بتائی ہے کہ آدمی برابر اپنے رب اور روزِ جزاء وسزا کو یاد رکھے۔ یہ یاد نفس کے توازن کو درست رکھتی ہے اور وہ کبھی اپنی خواہشوں سے اتنا مغلوب نہیں ہوتا کہ بالکل اس کے آگے سپر انداز ہو جائے۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو نفس لوامہ فوراً اس کو ٹوکتا ہے اور وہ متنبہ ہو کر توبہ وانابت سے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس نفس کے اندر یہ توازن پیدا ہو جائے قرآن نے اس کو نفس مطمئنہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ سورۃ الفجر۔ 27۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔3۔4۔ کا حاصل یہ ہے کہ تمہیں اس پر تعجب ہے کہ میّت کے ذرات منتشرہ اور بوسیدہ ہڈیوں کو جمع کیسے کیا جائے گا۔ حالانکہ یہ بات ایک مرتبہ مشاہدہ میں آچکی ہے کہ ہر انسان کا وجود جو دنیا میں پلتا اور بڑھتا ہے وہ دنیا بھر کے مختلف ملکوں اور خطوں کے اجزاء اور ذرات کا مرکب ہوتا ہے۔ تو جس ذاتِ قادر نے پہلی مرتبہ ساری دنیا میں بکھرے ہوئے ذرات کو ایک انسان کے وجود میں جمع کر دیا تھا، اس کے لیے دوبارہ جمع کرنا کیوں مشکل ہوگا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم صرف اسی پر قادر نہیں ہیں کہ مَیّت کے سارے اجزاء واعضاء کو دوبارہ اسی طرح بنا دیں بلکہ انسانی وجود کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی ہم ٹھیک اسی طرح کر دیں گے جس طرح وہ پہلے تھی۔ اس میں بنان یعنی انگلیوں کے پوروں کا خاص ذکر فرمایا کہ وہ سب سے چھوٹے اجزاء ہیں۔

اگر غور کیا جائے تو شاید انگلیوں کے پوروں کی تخصیص میں اس کی طرف بھی اشارہ ہو حق تعالیٰ نے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ممتاز کرنے کے لیے اس کے سارے ہی بدن میں ایسی خصوصیات رکھی ہیں جن سے وہ پہچانا جاتا ہے اور دوسروں سے ممتاز ہوتا ہے۔ خصوصاً انسانی چہرہ جو چند انچ مربع سے زائد نہیں، اس کے اندر قدرت حق نے ایسے امتیازات رکھے ہیں کہ اربوں انسانوں میں ایک کا چہرہ دوسرے کے ساتھ اتنا نہیں ملتا کہ امتیاز باقی نہ رہے۔ انسان کی زبان اور حلقوم ایک ہی طرح ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے ایسی ممتاز ہے کہ بچے، بوڑھے، عورت، مرد کی آوازیں الگ پہچانی جاتی ہیں۔ اور ہر انسان کی آواز الگ الگ پہچانی جاتی ہے۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز انسان کے انگوٹھے اور انگلیوں کے پور ہیں کہ ان کے اوپر جو نقش ونگار خطوط کے جال کی صورت میں قدرت نے بنائے ہیں وہ بھی ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ نہیں ملتے۔ صرف آدھ انچ کی جگہ میں ایسے امتیازات کہ اربوں انسانوں میں یہ پور مشترک ہونے کے باوجود ایک کے خطوط دوسرے سے نہیں ملتے۔ قدیم وجدید ہر زمانے میں انگوٹھے کے نشان کو ایک امتیازی چیز قرار دے کر اس پر عدالتی فیصلے ہوتے رہے ہیں، اور اب فنی تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ بات صرف انگوٹھے ہی میں نہیں بلکہ ہر انگلی کے پور کے خطوط بھی اسی طرح ممتاز ہوتے ہیں۔

یہ سمجھ لینے کے بعد بنان کے بیان کی تخصیص خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں تو اسی پر تعجب ہے کہ یہ انسان دوبارہ کیسے زندہ ہوگا۔ ذرا اس سے آگے سوچو اور غور کرو کہ وہ صرف زندہ ہی نہیں ہوگا بلکہ اپنی سابقہ شکل وصورت اور اس کے ہر امتیازی وصف کے ساتھ زندہ ہوگا۔ یہاں تک کہ انگوٹھے اور انگلیوں کے پوروں کے خطوط پہلی پیدائش میں جس طرح تھے، دوبارہ بھی بالکل وہی ہوں گے۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 4

آیات۔7۔9۔میں قیامت کے پہلے مرحلے میں نظام عالم کے درہم برہم ہوجانے کی کیفیت کا ایک مختصر بیان ہے۔ چاند کے بے نور ہوجانے اور چاند سورج کے مل کر ایک ہوجانے کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ صرف چاند ہی کی روشنی ختم نہ ہوگی جو سورج سے ماخوذ ہے، بلکہ خود سورج بھی تاریک ہوجائے گا اور بے نور ہوجانے میں دونوں یکساں ہوجائیں گے۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ زمین یکا یک الٹی چل پڑے اور اس دن چاند اور سورج دونوں بیک وقت مغرب سے طلوع ہوں گے۔ تیسرا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ چاند زمین کی کشش سے چھوٹ کر نکل جائے اور سورج میں جا پڑے۔ ممکن ہے اس کا کوئی اور مفہوم بھی ہو جس کو آج ہم نہیں سمجھ سکتے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 5

آیت۔13۔میں ہے بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ۔ یہ بڑا جامع فقرہ ہے جس کے کئی معنی ہو سکتے ہیں اور غالباً وہ سب ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی کو اس روز یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ اپنی دنیا کی زندگی میں مرنے سے پہلے کیا نیکی یا بدی کما کر اس نے اپنی آخرت کے لیے آگے بھیجی تھی۔ اور یہ حساب بھی اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا کہ اپنے اچھے یا برے اعمال کے کیا اثرات وہ اپنے پیچھے دنیا میں چھوڑ آیا تھا جو اس کے بعد مدت ہائے دراز تک آنے والی نسلوں میں چلتے رہے۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اسے وہ سب کچھ بتا دیا جائے گا جو اسے کرنا چاہیے تھا مگر اس نے نہیں کیا اور جو کچھ نہ کرنا چاہیے تھا مگر اس نے کر ڈالا۔ تیسرے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ اس نے پہلے کیا اور جو کچھ بعد میں کیا اس کا پورا حساب تاریخ وار اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ چوتھے معنی یہ ہیں کہ جو نیکی یا بدی اس نے کی وہ بھی اسے بتا دی جائے گی اور جس نیکی یا بدی کے کرنے سے وہ باز رہا اس سے بھی اسے آگاہ کیا جائے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ابن عباسؓ نے فرمایا کہ جو نیک کام اپنی موت سے پہلے کر لیا وہ آگے بھیج دیا۔ اور جو نیک یا بد، مفید یا مضر کوئی طریقہ، کوئی رسم ایسی چھوڑی کہ اس کے بعد لوگ اس پر عمل کریں، وہ اس نے پیچھے چھوڑا۔ اور حضرت قتادہؒ نے فرمایا کہ مَا قَدَّمَ سے مراد وہ عمل صالح جو اپنی زندگی میں کر گزرا اور مَا اَخَّرَ سے مراد وہ عمل صالح ہے جس کو کر سکتا تھا مگر نہ کیا اور فرصت ضائع کر دی۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (16 تا 30)

ح ر ك

(ك) حَرَكًا ہلنا۔حرکت کرنا۔

(تفعیل) تَحْرِيْكًا ہلانا۔حرکت دینا۔زیر مطالعہ آیت۔16۔

ن ض ر

(ن۔س) نَضْرَةً تروتازہ ہونا۔ملائم ہونا۔خوبصورت ہونے والا۔

نَضْرَةٌ اسم ذات بھی ہے۔تروتازگی۔ملائمیت، خوبصورتی۔﴿تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ ۚ﴾ (83/المطففین:32) ''تو پہچانے گا ان کے چہروں میں ہمیشگی کی تروتازگی کو۔''

نَاضِرَةٌ اسم الفاعل ہے۔تروتازہ ہونے والی۔زیر مطالعہ آیت۔32۔

ترجمہ 6940

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ	لِتَعْجَلَ بِهٖ ﴿۱۶﴾
آپؐ حرکت نہ دیں اس (قرآن) کے ساتھ اپنی زبان کو	تاکہ آپؐ جلدی یاد کریں اس کو

اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ	وَقُرْاٰنَهٗ ﴿۱۷﴾	فَاِذَا قَرَاْنٰهُ	فَاتَّبِعْ
بیشک ہم پر ہے اس کا جمع کرنا۔ (آپؐ کے سینے میں)	اور (آسان کرنا) اس کا پڑھنا	پھر جب بھی ہم (فرشتے کی زبان سے) پڑھیں اس کو	تو آپؐ پیچھے پیچھے چلیں

قُرْاٰنَهٗ ﴿۱۸﴾	ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ﴿۱۹﴾	كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ	الْعَاجِلَةَ ﴿۲۰﴾
اس کو پڑھے جانے کے	پھر بیشک ہم پر ہے اس کا ظاہر کرنا	ہرگز نہیں بلکہ تم لوگ پسند کرتے ہو	جلدی حاصل ہونے والی (دنیا) کو

وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَةَ ﴿۲۱﴾	وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ﴿۲۲﴾	اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ﴿۲۳﴾
اور تم لوگ چھوڑتے ہو پیچھے ہونے والی (آخرت) کو	کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہونے والے ہیں	اپنے رب کی طرف دیکھنے والے ہیں

وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ ﴿۲۴﴾	تَظُنُّ اَنْ يُّفْعَلَ	بِهَا فَاقِرَةٌ ﴿۲۵﴾
اور کچھ چہرے اس دن مرجھانے والے ہیں	وہ گمان کریں گے کہ کیا جائے گا	ان کے ساتھ (کمر) توڑنے والا کام

كَلَّآ اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ ﴿۲۶﴾	وَقِيْلَ مَنْ ۜ	رَاقٍ ﴿۲۷﴾
ہرگز نہیں جب کبھی پہنچتی ہے (جان) ہنسلیوں تک	اور کہا جاتا ہے کون (کوئی)	جھاڑ پھونک کرنے والا ہے

وَّظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ ﴿۲۸﴾	وَالْتَفَّتِ السَّاقُ بِالسَّاقِ ﴿۲۹﴾	اِلٰى رَبِّكَ يَوْمَئِذِ ِۨالْمَسَاقُ ﴿۳۰﴾
اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے	اور (جب) لپٹی ہے پنڈلی پنڈلی سے	(تو وہ سمجھتا ہے) تیرے رب کی طرف اُس دن ہانکا جانا ہے

نوٹ: 1

آیت۔16۔ سے لے کر۔19۔تک کی پوری عبارت ایک جملۂ معترضہ ہے جو سلسلہ کلام کو بیچ میں توڑ کر نبی ﷺ کو مخاطب کر کے ارشاد فرمائی گئی ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ نبوت کے ابتدائی دور میں جبکہ آپؐ کو وحی اخذ کرنے کی عادت اور مشق پوری طرح نہیں ہوئی تھی، آپؐ پر جب وحی نازل ہوتی تو آپ کو یہ اندیشہ لاحق ہوتا تھا کہ آپ! کو وہ کلام ٹھیک ٹھیک یاد رہ سکے گا یا نہیں۔اس لیے آپؐ وحی سننے کے ساتھ ساتھ اسے یاد کرنے کی کوشش کرنے لگتے تھے۔ایسی ہی صورت اس وقت پیش آئی جب حضرت جبریلؑ سورۂ قیامہ کی آیات آپؐ کو سنا رہے تھے۔ چنانچہ سلسلہ کلام کو توڑ کر آپ! کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپؐ وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ غور سے سنتے رہیں۔اسے یاد کرا دینا اور بعد میں ٹھیک ٹھیک آپؐ سے پڑھوا دینا ہمارے ذمہ ہے۔یہ فرمانے کے بعد اصل سلسلۂ کلام ''ہرگز نہیں! اصل بات یہ ہے'' سے پھر شروع ہو جاتا ہے جو لوگ اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں وہ اس مقام پر ان فقروں کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سلسلۂ کلام میں یہ بالکل بے جوڑ ہیں۔لیکن اس پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد کلام میں کوئی بے ربطی محسوس نہیں ہوتی۔اس کی مثال ایسے ہے جیسے ایک استاد درس دیتے ہوئے یہ دیکھے کہ طالب علم کسی اور طرف متوجہ ہے اور وہ درس کا سلسلہ روک کر طالب علم سے کہے کہ توجہ سے میری بات سنو اور اس کے آگے پھر اپنا درس شروع کر دے۔

ان آیات کے درمیان یہ فقرے بطور جملۂ معترضہ آنے کی جو توجیہ ہم نے کی ہے وہ محض قیاس پر مبنی نہیں ہے بلکہ مسند احمد، بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن جریر طبرانی، بیہقی وغیرہ میں معتبر روایات سے اس کی یہی وجہ بیان ہوئی۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔17۔میں لفظ جمع ایک جامع لفظ ہے۔اس سے مراد قرآن کو نبی ﷺ کے سینے میں محفوظ کرنا بھی ہے اور ان منتشر موتیوں کو ایک لڑی 6940 میں پرونا بھی ہے۔چنانچہ نبی ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے برابر رہنمائی حاصل ہوتی رہی کہ مختلف مواقع پر نازل ہونے والی آیات کو الگ الگ سورتوں میں کس ترتیب سے آپؐ جمع کرائیں۔چنانچہ اسی رہنمائی کی روشنی میں آپؐ نے الگ الگ سورتوں میں ان کے مواقع کے تعین کے ساتھ آیات جمع کرنے کی ہدایت فرمائی اور جمع کرنے والوں نے آپؐ کے حکم کی تعمیل کی۔اس کے علاوہ ایک مزید اہتمام اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کہ ہر رمضان میں نبی ﷺ حضرت جبریلؑ کے ساتھ اتنے قرآن کا مذاکرہ فرماتے جتنا نازل ہو چکا ہوتا تا کہ کسی سہو ونسیان کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ مبارک کے آخری رمضان میں آپؐ نے یہ مذاکرہ دو مرتبہ فرمایا۔(تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔19۔بڑی اہم آیت ہے جس سے چند ایسی اصولی باتیں ثابت ہوتی ہیں جنہیں آدمی اگر اچھی طرح سمجھ لے تو وہ ان گمراہیوں سے بچ سکتا ہے جو پہلے بھی بعض لوگ پھیلاتے رہے ہیں اور آج بھی پھیلا رہے ہیں۔اولاً اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر صرف وہی وحی نازل نہیں ہوتی تھی جو قرآن میں درج ہے، بلکہ اس کے علاوہ بھی وحی کے ذریعہ سے آپؐ کو ایسا علم دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں ہے۔اس لیے کہ قرآن کے الفاظ اور اس کی مخصوص اصطلاحات کا جو مفہوم حضورؐ کو سمجھایا جاتا تھا وہ اگر قرآن ہی میں درج ہوتا تو یہ کہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی کہ اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے، کیونکہ وہ تو پھر قرآن ہی میں مل جاتا۔لہٰذا یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مطالب قرآن کی جو تفہیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کی جاتی تھی وہ بہر حال الفاظ قرآن کے علاوہ تھی۔یہ وحی خفی (وحی غیر متلو) کا ایک اور ثبوت ہے جو ہمیں قرآن سے ملتا ہے۔(قرآن مجید سے اس کے مزید ثبوت ہم نے اپنی کتاب ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحات 94۔95۔اور صفحات 118 تا 125 میں پیش کر دیئے ہیں)۔

ثانیاً قرآن کے احکام کی تشریح جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کو بتائی گئی تھی وہ اسی لیے بتائی گئی تھی کہ آپؐ اپنے قول اور عمل سے اس کے مطابق لوگوں کو قرآن سمجھائیں اور قرآن کے احکام پر (اللہ کی مرضی کے مطابق۔مرتب) عمل کرنا سکھائیں۔اس لیے صرف ایک بیوقوف آدمی ہی یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تشریح علم کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا۔اللہ تعالیٰ نے خود سورۂ نحل کی آیت۔44۔میں فرمایا ہے:''اور اے نبیؐ یہ ذکر ہم نے تم پر اس لیے نازل کیا ہے تا کہ تم لوگوں کے سامنے اس تعلیم کی تشریح کرتے جاؤ جو ان کے لیے اتاری گئی ہے۔'' اور قرآن میں چار جگہ اللہ نے صراحت فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا کام صرف کتاب اللہ کی آیات سنا دینا ہی نہیں تھا بلکہ اس کتاب کی تعلیم دینا بھی تھا۔(ان سب آیات کی تشریح ہم ''سنت کی آئینی حیثیت'' میں صفحہ 74 تا 77 میں تفصیل کے ساتھ کر چکے ہیں)۔اس کے بعد کوئی ایسا آدمی جو قرآن کو مانتا ہو اس بات کو تسلیم کرنے سے کیسے انکار کر سکتا ہے کہ قرآن کی مستند اور سرکاری تشریح صرف وہ ہے جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے قول اور عمل سے فرما دی ہے کیونکہ وہ آپؐ کی ذاتی تشریح نہیں ہے بلکہ قرآن نازل کرنے والے خدا کی بتائی ہوئی تشریح ہے۔

ثالثاً قرآن کا سرسری مطالعہ بھی اگر کسی شخص نے کیا ہو تو وہ یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس میں بکثرت باتیں ایسی ہیں جنہیں ایک عربی جاننے والا محض قرآن کے الفاظ پڑھ کر یہ نہیں جان سکتا کہ ان کا حقیقی مدعا کیا ہے اور ان میں جو حکم بیان کیا گیا ہی اس پر کیسے عمل کیا جائے۔مثال کے طور پر لفظ صلوٰۃ ہے۔محض عربی لغت کی مدد سے کوئی شخص اس کا مفہوم تک تعین نہیں کر سکتا۔قرآن میں اس کا ذکر بار بار دیکھ کر وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ اس لفظ کو کسی خاص اصطلاحی معنی میں استعمال کیا گیا ہے اور اس سے مراد کوئی خاص فعل ہے لیکن قرآن پڑھ کر کوئی عربی جاننے والا یہ طے نہیں کر سکتا کہ وہ خاص فعل کیا ہے اور کس طرح اسے ادا کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ایک معلم کو مقرر کر کے صلوٰۃ کے حکم کی تعمیل کرنے کا طریقہ پوری وضاحت کے ساتھ اسے سکھا دیا جس کی وجہ سے آج ڈیڑھ ہزار 6940 برس سے مسلمان نسل در نسل نماز کے حکم پر یکساں عمل کر رہے ہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ پر صرف قرآن کے الفاظ ہی وحی نہیں فرمائے تھے بلکہ ان الفاظ کا مطلب بھی آپؐ کو پوری طرح سمجھا دیا تھا۔

رابعًا قرآن کے الفاظ کی جو تشریح اللہ نے اپنے رسولؐ کو بتائی اور رسولؐ نے اپنے قول و عمل سے اس کی جو تعلیم امت کو دی، اس کو جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس حدیث و سنت کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ حدیث سے مراد وہ روایات ہیں جو حضورؐ کے اقوال و افعال کے متعلق سند کے ساتھ اگلوں سے پچھلوں تک منتقل ہوئیں۔ اور سنت سے مراد وہ طریقہ ہے جو حضورؐ کی قولی و عملی تعلیم سے مسلم معاشرے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں رائج ہوا۔ اس ذریعہ علم کو جو شخص قبول کرنے سے انکار کرتا ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت۔19۔ میں قرآن کا مطلب اپنے رسول کو سمجھا دینے کی جو ذمہ داری لی تھی اسے پورا کرنے میں معاذ اللہ وہ ناکام ہو گیا ہے۔ (والعیاذ باللہ)

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بہت سے لوگوں نے حدیثیں گھڑ لی تھی، تو ان کا یہ قول خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ آغازِ اسلام میں پوری امت رسول اللہ ﷺ کے اقوال و اعمال کو قانون کا درجہ دیتی تھی، ورنہ گمراہی پھیلانے والوں کو جھوٹی حدیثیں گھڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ جعل ساز لوگ وہی سکے جعلی بناتے ہیں جن کا بازار میں چلن ہو۔ جن نوٹوں کی بازار میں کوئی قیمت نہ ہو انہیں کون جعلی طور پر چھاپے گا۔ پھر ایسی بات کہنے والوں کو شاید یہ معلوم نہیں ہے کہ اس امت نے اول روز سے اس بات کا اہتمام کیا تھا کہ جس ذاتِ پاکؐ کے اقوال و افعال قانون کا درجہ رکھتے ہیں اس کی طرف کوئی غلط بات منسوب نہ ہونے پائے۔ اس امت کے خیر خواہ لوگوں نے اس بات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا تھا کہ صحیح کو غلط سے ممیز کیا جائے۔ صحیح و غلط روایات کی تمیز کا یہ علم ایک بڑا ہی عظیم الشان علم ہے جو مسلمانوں کے سوا دنیا کی کسی قوم نے آج تک ایجاد نہیں کیا۔ سخت بدنصیب ہیں وہ لوگ جو اس علم کو حاصل کیے بغیر حدیث سنت کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج۶، ص۱۶۹ تا ۱۷۱ سے ماخوذ)

نوٹ: 4 اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی انسانی صلاحیت کے متعلق بات ہو چکی ہے۔ آیت نمبر 6/ الانعام: 103، نوٹ۔ 1 ﷺ دوبارہ دیکھ لیں۔

آیت نمبر (31 تا 40)

م ط ی

(س) مَطِيًّا لمبا ہونا۔ دراز ہونا۔

(تفعل) تَمَطَّيَا بتکلف دراز ہونا۔ اکڑ کر چلنا۔ زیر مطالعہ آیت۔33۔

ترجمہ

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾	وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۳۲﴾
پھر اس نے نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی	اور لیکن (بلکہ) اس نے جھٹلایا اور روگردانی کی

ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ	يَتَمَطّٰى ﴿۳۳﴾	اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۴﴾
پھر وہ گیا اپنے گھر والوں کی طرف	اکڑتا ہوا	(تباہی) زیادہ قریب ہے تیرے لیے، زیادہ قریب

ثُمَّ	اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ﴿۳۵﴾	اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ ﴿۳۶﴾ 6940
پھر (I Repeat)	(تباہی) زیادہ قریب ہے تیرے لیے، زیادہ قریب	کیا سمجھتا ہے انسان

اَنْ يُّتْرَكَ	سُدًى ﴿۳۶﴾	اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً	مِّنْ مَّنِيٍّ	يُّمْنٰى ﴿۳۷﴾
کہ وہ چھوڑ دیا جائے گا	(یوں ہی) بے لگام	کیا وہ نہیں تھا ایک ایسی بوند	کسی منی میں سے جو	ٹپکائی گئی

ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً	فَخَلَقَ	فَسَوّٰى ﴿۳۸﴾	فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ
پھر وہ تھا خون کا ایک لوتھڑا	تو اس نے بنایا (اس کو)	پھر اس نے (ناک نقشہ) درست کیا	پھر اس نے بنائے اس سے جوڑے

الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۳۹﴾	اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ	عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ﴿۴۰﴾
مذکر اور مؤنث کے	کیا وہ قدرت رکھنے والا نہیں ہے	اس پر کہ وہ زندہ کرے مُردوں کو

نوٹ:1

آیات۔31 تا33۔کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص آخرت کو ماننے کے لیے تیار نہ تھا اس نے وہ سب کچھ سنا جو اوپر کی آیات میں بیان کیا گیا ہے، مگر پھر بھی وہ اپنے انکار پر ہی اڑا رہا اور یہ آیات سننے کے بعد اکڑتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا ہے اس میں یہ الفاظ کہ فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ﴿۳۱﴾ خاص طور پر توجہ کے مستحق ہیں۔ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب کی صداقت تسلیم کر لینے کا اولین اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی نماز پڑھے۔اللہ کے دوسرے احکام کی تعمیل کی نوبت تو بعد میں آتی ہے، لیکن ایمان کے اقرار کے بعد کچھ زیادہ مدت نہیں گزرتی کہ نماز کا وقت آجاتا ہے۔اس وقت معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی نے زبان سے جس چیز کے ماننے کا اقرار کیا ہے وہ کس حد تک اس کے دل کی آواز ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

عربی زبان میں اِبِلٌ سُدًی اس اونٹ کے لیے بولتے ہیں جو یوں ہی چھوٹا پھر رہا ہو، جہاں چاہے چرتا پھرے اور کوئی اس کی نگرانی کرنے والا نہ ہو۔اس معنی میں ہم شتر بے مہار کا لفظ بولتے ہیں۔پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ کیا انسان نے اپنے آپ کو شتر بے مہار سمجھ رکھا ہے کہ اس کے خالق نے اسے زمین میں غیر ذمہ دار بنا کر چھوڑ دیا ہے۔کوئی فرض اس پر عائد نہ ہو۔کوئی چیز اس کے لیے ممنوع نہ ہو۔اور کوئی وقت ایسا آنے والا نہ ہو جب اس سے اس کے اعمال کی باز پرس کی جائے، یہی بات سورۃ المومنون کی آیت۔115۔میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ''کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں کبھی ہماری طرف پلٹ کر نہیں آنا ہے۔''

ان دونوں مقامات پر موت کے بعد کی زندگی کے واجب ہونے کی دلیل سوال کی شکل میں پیش کی گئی ہے۔سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا تم نے اپنے آپ کو جانور سمجھ رکھا ہے۔کیا تمہیں اپنے میں اور جانور میں یہ کھلا فرق نظر نہیں آتا کہ وہ بے اختیار ہے اور تم بااختیار ہو۔اس کے افعال میں اخلاقی حسن و قبح کا سوال پیدا نہیں ہوتا اور تمہارے افعال میں یہ سوال لازماً پیدا ہوتا ہے۔پھر تم نے اپنے متعلق یہ کیسے سمجھ لیا کہ جس طرح جانور غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ ہے اسی طرح تم بھی ہو۔جانور کے دوبارہ زندہ کر کے نہ اٹھانے کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کیونکہ اس پر اپنے کسی عمل کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی جس کی باز پرس کے لیے اسے دوبارہ زندہ کرنے کی حاجت ہو۔لیکن تم حیات بعد موت سے کیسے معاف کیے جا سکتے ہو جبکہ مرتے دم تک تم ایسے اخلاقی افعال کرتے رہتے ہو جن کے نیک یا بد ہونے اور جزا یا سزا کے مستوجب ہونے کا خود تمہاری عقل حکم لگاتی ہے۔(تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سورۂ قیامہ کی آخری آیت کی تلاوت کرے، اس کو یہ کلمات کہنے چاہیے، بَلٰی وَ اَنَا عَلٰی ذٰلِكَ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ یعنی بلاشبہ وہ اس پر قادر ہے اور میں بھی ان لوگوں میں داخل ہوں جو اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اس حدیث میں یہی الفاظ سورۂ والتین کی آخری آیت پڑھنے کے وقت بھی کہنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اسی حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص سورۂ مرسلٰت کی آخری آیت پر پہنچے تو اس کو اٰمَنَّا بِاللّٰہِ کہنا چاہیے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ (76)

آیت نمبر (1 تا 10)

م ش ج

(ن) مَشْجًا — خلط ملط کرنا۔ ملانا۔

مَشِیْجٌ — ج اَمْشَاجٌ مخلوط۔ ملا ہوا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

م ز ج

(ن) مَزْجًا — پینے کی چیز میں کچھ ملانا جیسے شراب میں پانی ملانا۔

مِزَاجٌ — جو چیز ملائی جائے۔ ملاوٹ۔ آمیزش۔ زیر مطالعہ آیت۔5۔

ترجمہ

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ	حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ	لَمْ يَكُنْ	شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا ①
کیا پہنچا (گزرا) انسان پر	کوئی ایسا وقت زمانے میں سے	جب وہ تھا ہی نہیں	کوئی ذکر کی جانے والی چیز

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ	مِنْ نُّطْفَةٍ	اَمْشَاجٍ	نَّبْتَلِيْهِ
بیشک ہم نے پیدا کیا انسان کو	ایک ایسی بوند سے جو	ملی جلی چیزوں سے تھی	ہم (رحم مادر میں) الٹتے پلٹتے رہے اس (انسان) کو

فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ②	اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ	اِمَّا شَاكِرًا وَّ اِمَّا كَفُوْرًا ③
پھر ہم نے بنایا اس کو سننے والا دیکھنے والا	بیشک ہم نے سجھا دیا اس کو یہ راستہ	(اب) چاہے شکر کرنے والا ہو اور چاہے ناشکری کرنے والا ہو

اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ	سَلٰسِلَا۟ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِيْرًا ④	اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ
بیشک ہم نے تیار کیا کافروں کے لیے	زنجیریں اور طوق اور دہکتی آگ	بیشک نیک لوگ پئیں گے

مِنْ كَاْسٍ	كَانَ مِزَاجُهَا	كَافُوْرًا ⑤	عَيْنًا	يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ
ایک ایسے جام سے	جس کی آمیزش	کافور ہے	جو ایک چشمہ ہے	پئیں گے جس سے اللہ کے بندے

يُفَجِّرُوْنَهَا	تَفْجِيْرًا ⑥	يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ	وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا
وہ لوگ جاری کریں گے اس کو	جیسے جاری کرنے کا حق ہے	وہ لوگ (اس دنیا میں) پوری کرتے ہیں منت	اور ڈرتے ہیں ایک ایسے دن سے

كَانَ شَرُّهٗ	مُسْتَطِيْرًا ۝۷	وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ	عَلٰى حُبِّهٖ 6940
جس کا شر	پھیل جانے والا ہے	اور وہ لوگ کھلاتے ہیں کھانا	اس (کھانے) کی محبت کے باوجود

مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝۸	اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ	لِوَجْهِ اللّٰهِ
مسکین کو اور یتیم کو اور قیدی کو	(کہتے ہیں) ہم تو بس کھلاتے ہیں تم کو	اللہ کی توجہ (حاصل کرنے) کے لیے

لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ	جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝۹	اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا
ہم نہیں چاہتے تم سے	کوئی بدلہ اور نہ کوئی احسان ماننا	بیشک ہم ڈرتے ہیں اپنے رب سے

يَوْمًا	عَبُوْسًا	قَمْطَرِيْرًا ۝۱۰
ایک ایسے دن سے جو	بہت ترش ہوگا	بہت شدید ہوگا

نوٹ:1

اکثر مفسرین نے یہاں هَلْ کو قَدْ کے معنی میں لیا ہے اور وہ اس کے معنی یہ لیتے ہیں کہ بیشک انسان پر ایسا ایک وقت آیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ لفظ هَلْ عربی زبان میں ''کیا'' کے معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اس سے مقصود ہر حال میں سوال ہی نہیں ہوتا بلکہ مختلف مواقع پر یہ بظاہر سوالیہ لفظ مختلف معانی میں بولا جاتا ہے۔ مثلاً کبھی ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں واقعہ پیش آیا ہے یا نہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا یہ واقعہ ہوا ہے؟ کبھی ہمارا مقصود سوال نہیں بلکہ کسی بات کا انکار کرنا ہوتا ہے اور یہ انکار ہم اس انداز میں کرتے ہیں کہ کیا یہ کام کوئی اور بھی کرسکتا ہے۔ (یعنی نہیں کرسکتا)۔ کبھی ہم کسی بات کا اقرار کرانا چاہتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ کیا میں نے تمہاری رقم ادا کردی۔ اور کبھی ہمارا مقصود محض اقرار ہی کرانا نہیں ہوتا بلکہ سوال ہم اس غرض سے کرتے ہیں کہ مخاطب کے ذہن کو ایک اور بات سوچنے پر مجبور کردیں جو لازماً اقرار کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہم کسی سے پوچھتے ہیں کہ کیا میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی کی ہے۔ اس سے مقصود صرف یہ نہیں ہوتا کہ وہ اس بات کا اقرار کرے کہ آپ نے اس کے ساتھ کوئی برائی نہیں کی ہے، بلکہ اسے یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہوتا ہے کہ جس نے میرے ساتھ کوئی برائی نہیں کی اس کے ساتھ میں برائی کرنے میں کہاں تک حق بجانب ہوں۔ آیت زیر بحث میں سوالیہ فقرہ دراصل اسی آخری معنی میں ارشاد ہوا ہے۔ اس سے مقصود انسان سے صرف یہی اقرار کرانا نہیں ہے کہ فی الواقعہ اس پر ایک ایسا وقت گزرا ہے، بلکہ یہ سوچنے پر مجبور کرنا بھی ہے کہ جس خدا نے اس کی تخلیق کا آغاز ایسی حقیر سی حالت سے کرکے اسے پورا انسان بنا کھڑا کیا وہ اسے دوبارہ پیدا کرنے سے آخر کیوں عاجز ہوگا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ میں لفظ اَمْشَاجٍ جمع ہے مَشِيْجٌ کی (جبکہ نُّطْفَةٍ واحد ہے) اس کے معنی ملی جلی اور مخلوط چیز کے ہیں۔ اَمْشَاجٍ اگرچہ جمع ہے لیکن یہ ان الفاظ میں سے ہے جو جمع ہونے کے باوجود مفرد الفاظ کی صفت کے طور پر آئے ہیں۔ (تدبر قرآن)۔

اِمْشَاجٌ کے معنی مخلوط کے آتے ہیں اور یہاں ظاہر یہ ہے کہ مرد و زن کا مخلوط نطفہ مراد ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے فرمایا ہے۔ اور روح المعانی میں بعض مفسرین سے نقل کیا ہے کہ امشاج سے مراد اخلاطِ اربعہ یعنی خون، بلغم، سودا اور صفراء ہیں جن سے نطفہ مرکب ہوتا ہے۔ اور اگر غور کیا جائے تو یہ اخلاطِ اربعہ بھی اقسام غذا سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور ہر انسان کی غذا میں غور کیا جائے تو اس میں دور دراز ملکوں اور خطوں کی آب و ہوا کے اجزاء شامل ہوتے ہیں۔ اس طرح ایک انسان کے موجودہ جسم کا تجزیہ اور تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایسے اجزاء و ذرات کا مجموعہ ہے جو دنیا کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے تھے۔ قدرت کے نظامِ عجیب نے حیرت انگیز طریقہ پر

ان کو اس کے وجود میں سمویا۔ ہے۔ اگر امشاج کا یہ مطلب لیا جائے تو اس جگہ لفظ امشاج کے ذکر سے منکرین قیامت کے سب سے بڑے شبہ کا ازالہ بھی ہو جائے گا۔ کیونکہ ان لوگوں کے نزدیک قیامت قائم ہونے اور مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے میں سب سے بڑا اشکال یہی ہے کہ انسان مر کر مٹی اور پھر ریزہ ریزہ ہو کر دنیا میں بکھر جاتا ہے، ان کو دوبارہ جمع کرنا پھر ان میں روح ڈالنا ان کے نزدیک گویا ناممکن ہے۔ امشاج کی اس تفسیر میں ان کے اس شبہ کا واضح جواب ہے کہ ابتدائی تخلیق انسان میں بھی تو دنیا بھر کے اجزاء و ذرات شامل تھے۔ جس کو یہ ابتدائی تخلیق مشکل نہ ہوئی اس کے لیے اس کا دوبارہ پیدا کرنا کیوں مشکل ہو گیا۔ اس طرح اس جگہ لفظ امشاج کا اضافہ ایک مستقل فائدہ کے لیے ہو سکتا ہے۔ (معارف القرآن)۔ کیونکہ لفظ امشاج کے بغیر صرف لفظ نطفہ سے بھی بات مکمل ہو جاتی ہے۔ اس کے باجود اگر اس پر لفظ امشاج کا اضافہ کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ زیب داستان کے لیے نہیں ہے بلکہ اس کا کوئی مقصد ہے۔ (مرتب)

نَبْتَلِيْهِ کو عام طور پر لوگوں نے بیان علت کے مفہوم میں لیا ہے، یعنی ہم نے انسان کو آزمانے کے لیے پیدا کیا۔ لیکن یہ اگر علت کے مفہوم میں ہوتا تو اس پر لامِ علت آنا تھا حالانکہ یہ حال کی صورت میں ہے اور حال کا مفہوم علت کے مفہوم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک یہ حال ہی کے مفہوم میں ہے اور مطلب اس کا یہ ہے کہ ہم نے انسان کو اس طرح (یعنی اس حال میں۔ مرتب) پیدا کیا کہ درجہ بدرجہ اس کو مختلف اطوار و مراحل سے گزارتے ہوئے ایک سمیع و بصیر مخلوق کے درجے تک پہنچا دیا۔ ابتلاء کے معنی لغت میں جانچنے پرکھنے کے ہیں۔ آدمی جب کسی چیز کو جانچتا ہے تو اس کو مختلف پہلوؤں سے الٹ پلٹ کر اور ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے۔ یہیں سے اس کے اندر ایک طور سے گزار کر دوسرے طور میں لے جانے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ یہاں یہ لفظ اسی معنی میں ہے۔

انسان کی تخلیق جن اطوار و مراحل سے گزر کر مرتبۂ تکمیل تک پہنچتی ہے اس کی وضاحت قرآن مجید میں جگہ جگہ ہوئی ہے۔ مثلاً سورۂ حج کی آیت۔ 5۔ میں ہے کہ ہم نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک نطفہ سے پھر خون کی ایک پھٹکی سے پھر گوشت کی ایک بوٹی سے، کوئی تمام اور کوئی ناتمام۔ پھر ہم رحموں میں ٹھہراتے ہیں جتنا چاہتے ہیں ایک مدت معین تک پھر ہم تم کو بچے کی صورت میں باہر لاتے ہیں پھر ہم تم کو پروان چڑھاتے ہیں کہ تم اپنی جوانی کو پہنچو۔ انہی اطوار و مراحل کی تفصیل سورۂ مومنون کی ایات۔ 12 تا 14۔ میں یوں آئی ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا مٹی کے جوہر سے پھر ہم نے اس کو رکھا ایک نطفہ کی صورت میں ایک محفوظ ٹھکانے میں پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کی پھٹکی کی شکل دی پھر خون کی پھٹکی کو مضغۂ گوشت بنایا پھر گوشت میں ہڈیاں پیدا کیں اور ہڈیوں کو گوشت کا جامہ پہنایا پھر اس کو ایک بالکل دوسری ہی مخلوق کی صورت میں کھڑا کر دیا۔

ان آیات میں جن اطوار و مراحل کی تفصیل ہے انہی کی طرف آیت زیر بحث میں اجمال کے ساتھ اشارہ فرمایا ہے اور انہی مراحل سے درجہ بدرجہ گزارنے کے لیے لفظ نَبْتَلِيْهِ آیا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس قطرے کو گہر ہونے تک بہت سے مرحلے طے کرنے پڑے ہیں اور ہر مرحلہ میں قدرت نے اس کو اچھی طرح جانچ پرکھا ہے کہ جس دور میں جو صلاحیت اس کے اندر پیدا ہونی چاہیے وہ پیدا ہو گئی یا نہیں۔ پھر وہ دور آیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو سمع و بصر کی اعلیٰ صفات سے متصف ہستی بنا دیا۔ یہاں پر سَمِيْعًا بَصِيْرًا انسان کی تمام اعلیٰ صفات کی نہایت جامع تعبیر ہے۔ انہی صفات کے فیض سے انسان کے اندر خیر و شر میں امتیاز کی صلاحیت پیدا ہوئی اور وہ اس قابل ٹھہرا کہ اللہ تعالیٰ اس کا امتحان کرے کہ وہ خیر کی راہ اختیار کر کے اپنے رب کا شکر گزار بندہ بنتا ہے یا شر کی راہ اختیار کر کے ناشکرا بن جاتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ بھی نکلنا لازمی ہے ورنہ اس سارے اہتمام کا کیا مقصد جو انسان کی پیدائش کے لیے قدرت نے کیے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:3

کوئی نیک کام کرنے کا عہد کر لینے کو نذر (منت) کہتے ہیں۔ وفادار بندوں (ابرار) کے اوصاف میں ایفائے نذر کو خاص طور سے نمایاں کیا گیا 6940 ہے۔ جو لوگ ایسی نذروں کو پورا کرنے کا بھی اہتمام کریں جو انہوں نے بطور خود اپنے اوپر واجب کی ہوں، ان سے ایسی نیکیوں کے اہتمام کی توقع بدرجۂ اولیٰ ہے جو ان کے رب نے ان پر واجب ٹھہرائی ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نذر کی اہمیت سابق ادیان میں بھی بہت رہی ہے اور عرب جاہلیت میں بھی اس کا بڑا اہتمام تھا۔ عربوں کے اندر اس کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ دین کے طریقے ان کو واضح طور پر معلوم نہیں تھے اس لیے ان کے نیک لوگ نذروں کے ذریعے سے اس خلا کو بھرتے تھے۔ اسلام کے آجانے کے بعد جب شریعت کے اصول و فروع لوگوں کو معلوم ہو گئے تو اس کا دائرہ محدود ہو گیا۔ وہ نذریں جو مشرکانہ نوعیت کی تھیں، وہ تو بالکل ہی ختم کر دی گئیں۔ جو نذریں تکلف مالا یطاق نوعیت کی تھیں، وہ بھی یا تو ممنوع قرار پا گئیں یا ان کی اصلاح کر دی گئی۔ یہ سورہ چونکہ اس دور کی ہے جب شریعت کے احکام و آداب تفصیل سے معلوم نہیں ہوئے تھے، اس وجہ سے اس میں اس کا ذکر خاص اہمیت سے ہوا ہے۔ بعد میں جب شریعت کا پورا میثاق نازل ہو گیا تو اس کا دائرہ نہایت محدود ہو گیا۔ (تدبر قرآن)۔

فقہاء نے نذر کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی اللہ سے یہ عہد کرے کہ وہ اس کی رضا کی خاطر فلاں نیک کام کرے گا۔ دوسرے یہ کہ وہ اس بات کی نذر مانے کہ اگر اللہ نے میری فلاں حاجت پوری کر دی تو میں شکرانے میں فلاں نیک کام کروں گا۔ ان دونوں قسم کی نذروں پر اتفاق ہے کہ اسے پورا کرنا واجب ہے۔ تیسرے یہ کہ آدمی کوئی ناجائز کام کرنے یا کوئی واجب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔ چوتھے یہ کہ آدمی کوئی مباح کام کرنے کو اپنے اوپر لازم کر لے یا کوئی مستحب کام نہ کرنے کا عہد کر لے۔ تیسری قسم کی نذر کے متعلق اتفاق ہے کہ وہ منعقد ہی نہیں ہوتی۔ چوتھی قسم کے متعلق فقہاء میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اسے پورا کرنا چاہیے۔ بعض کہتے ہیں کہ قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ آدمی کو اختیار ہے، خواہ نذر پوری کر دے یا کفارہ ادا کر دے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (11 تا 22)

ترکیب

(آیت۔ 11) فَوَقٰهُمْ اور لَقّٰهُمْ میں هُمْ کی ضمیریں آیت۔5۔ میں مذکور اَلْاَبْرَارَ کے لیے ہے جبکہ ذٰلِكَ الْيَوْمِ میں اشارہ گزشتہ آیت میں مذکور يَوْمًا عَبُوْسًا کے لیے ہے۔ (آیت۔14) دَانِيَةً حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے اور یہ اسم الفاعل ہے۔ یہاں پر اس نے فعل کا عمل کیا ہے۔ (دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:54، نوٹ۔1) ظِلٰلُهَا اس کا فاعل ہے۔ ذُلِّلَتْ کا نائب فاعل قُطُوْفُهَا ہے۔ قُطُوْفٌ جمع مکسر ہے اس لیے فعل ذُلِّلَتْ واحد مؤنث آیا ہے۔ (آیت۔15) بِاٰنِيَةٍ کے حرفِ جَرِ پر عطف ہونے کی وجہ سے اَكْوَابٍ حالت جر میں آیا ہے۔ اٰنِيَةٍ اور اَكْوَابٍ کو يُطَافُ کا نائب فاعل مان کر بھی ترجمہ کیا گیا ہے۔ لیکن حافظ احمد یار صاحب کی رائے ہے کہ يُطَافُ کا نائب فاعل اس میں شامل ضمیر ہے جو خُدّام کے لیے ہے۔ ترجمہ شیخ الہند کے ترجمہ میں بھی اسی لحاظ سے ترجمہ ہے۔ ہم اسی کو ترجیح دیں گے۔ قَوَارِيْرُ آتا ہے۔ یہاں الف کے اضافے کے ساتھ لکھنا قرآن کا مخصوص املا ہے۔ (آیت۔21) عٰلِيَهُمْ میں اسم الفاعل عَالٍ حال ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں عَالِيًا ہے مضاف ہونے کی وجہ سے تنوین ضم ہوئی تو عَالِيَ استعمال ہوا۔ یہ بھی یہاں فعل کا عمل کر رہا ہے۔ ثِيَابُ سُنْدُسٍ اس کا فاعل ہے۔ خُضْرٌ اِسْتَبْرَقٌ صفت نہیں ہیں۔ اگر یہ ثِيَابُ کی صفت ہوتے تو اَلْخُضْرُ اور اَلْاِسْتَبْرَقُ آتے۔ کیونکہ ثِيَابُ سُنْدُسٍ اضافت کی وجہ سے معرفہ ہے جب موصوف معرفہ ہو تو صفت بھی معرفہ ہی ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ خبر ہیں اور ان کا مبتدا هِيَ محذوف ہے جو ثِيَابُ کے لیے ہے۔ (آیت۔22) اِنَّ کا اسم هٰذَا ہے اور محلاً حالت نصب میں

ہے۔اس کے آگے پورا جملہ کَانَ لَکُمْ جَزَاءً۔ اِنَّ کی خبر ہے اور محلاً حالتِ رفع میں ہے۔اس جملے میں کَانَ کا اسم اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر ہے اور اس کی خبر ہونے کی وجہ سے جزاءً حالتِ نصب میں ہے۔اگلے جملے میں کَانَ کا اسم سَعْیُکُمْ ہے اور مَشْکُوْرًا اس کی خبر ہے۔ان آیات میں قیامت کے حالات کا ذکر ہے۔اس لیے افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا۔(دیکھیں آیت۔2/البقرۃ:27،نوٹ۔3)

ترجمہ

فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ	شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ	وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ⑪
تو بچایا ان کو اللہ نے	اس دن کے شر سے	اور دی ان کو تازگی اور سرور

وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا	جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ⑫	مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا
اور اس نے بدلے میں دیا ان کو بسبب اس کے جو وہ ثابت قدم رہے	ایک باغ اور باریک ریشم	ٹیک لگا کر بیٹھنے والے ہوتے ہوئے اس میں

عَلَى الْاَرَآىِٕكِ	لَا يَرَوْنَ فِيْهَا	شَمْسًا وَّلَا زَمْهَرِيْرًا ⑬
آراستہ تختوں پر	وہ لوگ نہیں دیکھیں گے اس میں	کوئی سورج (دھوپ) اور نہ کوئی ٹھٹھرن

وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ	ظِلٰلُهَا	وَذُلِّلَتْ قُطُوْفُهَا
اور نزدیک ہونے (جھکنے) والے ہوتے ہوئے ان پر	اس کے سائے	اور مطیع کیے (جھکائے) گئے اس کے پھل

تَذْلِيْلًا ⑭	وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ	بِاٰنِيَةٍ مِّنْ فِضَّةٍ
جیسی جھکائے جانے کا حق ہے	اور گھمائے پھرائے جائیں گے ان کے گرد (خدام)	ایسے برتنوں کے ساتھ جو چاندی کے ہوں گے

وَّاَكْوَابٍ	كَانَتْ قَوَارِيْرَا ⑮	قَوَارِيْرَا مِنْ فِضَّةٍ
اور ایسے آبخوروں کے ساتھ جو	ہوں گے شیشے کے	(وہ) شیشے چاندی کے ہوں گے

قَدَّرُوْهَا	تَقْدِيْرًا ⑯	وَيُسْقَوْنَ فِيْهَا	كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا
(خدّام) اندازہ مقرر کریں گے جن کا	جیسے اندازہ کرنے کا حق ہے	وہ (ابرار) لوگ پلائے جائیں گے اس میں	ایک ایسے پیالے سے جس کی ملاوٹ

زَنْجَبِيْلًا ⑰	عَيْنًا فِيْهَا	تُسَمّٰى	سَلْسَبِيْلًا ⑱	وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ
ادرک ہے	جو ایک چشمہ ہے اس میں	اس کو نام دیا جائے گا	سلسبیل	اور گھومیں پھریں گے ان کے گرد

وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ	اِذَا رَاَيْتَهُمْ	حَسِبْتَهُمْ	لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا ⑲
ہمیشگی دیئے ہوئے کم عمر لڑکے	جب بھی تو دیکھے گا ان کو	تو تو گمان کرے گا ان کو	بکھیرے ہوئے موتی

وَاِذَا رَاَيْتَ	ثَمَّ رَاَيْتَ	نَعِيْمًا	وَّمُلْكًا كَبِيْرًا ⑳
اور جب بھی تو دیکھے گا	تو وہیں تو دیکھے گا	دائمی خوشحالی	اور ایک بڑی بادشاہت

عٰلِيَهُمْ	ثِيَابُ سُنْدُسٍ	خُضْرٌ وَّ اِسْتَبْرَقٌ ۡ	وَحُلُّوْٓا
چڑھنے والے ہوتے ہوئے ان پر	کچھ باریک ریشم کے کپڑے ہوں گے	(وہ) سبز اور بھڑکیلے ہوں گے	اور ان کو آراستہ کیا جائے گا

اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّةٍ ۚ	وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ	شَرَابًا طَهُوْرًا ﴿۲۱﴾
چاندی کے کنگنوں سے	اور پلائے گا ان کو ان کا رب	ایک نہایت پاکیزہ مشروب

اِنَّ هٰذَا	كَانَ لَكُمْ جَزَآءً	وَّ كَانَ سَعْيُكُمْ	مَّشْكُوْرًا ﴿۲۲﴾ ع
بیشک یہ	ہوگا تمہارے لیے ایک بدلہ	اور ہوگی تمہاری دوڑ دھوپ	قدر کی ہوئی

نوٹ:1

آیت۔13۔ میں سورج اور زمہریر نہ دیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ گرمی اور سردی دونوں کی اذیتوں سے محفوظ رہیں گے۔ ان کے سورج میں روشنی اور قوت بخشی تو ہوگی مگر اس میں حدت اور تمازت نہ ہوگی۔ وہاں کا موسم معتدل اور پُر بہار رہے گا۔ خزاں کی نحوست اور بادِ زمہریر (یخ ٹھنڈی ہوا) سے ان کو کبھی سابقہ پیش نہیں آئے گا۔ (تدبر قرآن)۔

اگلی آیت میں شاید درختوں کی شاخوں کو ظلال (سائے) سے تعبیر فرمایا ہے یا واقعی سایہ ہو۔ کیونکہ آفتاب کی دھوپ نہ سہی کوئی دوسری قسم کا نور ہوگا۔ اس کے سایہ میں بہشتی تفنن وتفریح کی غرض سے کبھی بیٹھنا چاہیں گے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:2

آیت۔16۔ میں چاندی کے شیشے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہوگی تو چاندی مگر شیشے کی طرح شفاف ہوگی۔ چاندی کی یہ قسم اس دنیا میں نہیں پائی جاتی۔ یہ صرف جنت کی خصوصیت ہوگی کہ وہاں شیشے جیسی شفاف چاندی کے برتن اہل جنت کے دسترخوان پر ہوں گے۔

اور قَدَّرُوْهَا تَقْدِيْرًا کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کے لیے اس کی خواہش کے ٹھیک اندازے کے مطابق ساغر بھر بھر کر دیئے جائیں گے۔ نہ وہ اس کی خواہش سے کم ہوں گے نہ زیادہ۔ دوسرے الفاظ میں اہل جنت کے خدام اس قدر ہوشیار اور تمیز دار ہوں کہ وہ جس کی خدمت میں جام پیش کریں گے اس کے متعلق ان کو پورا اندازہ ہوگا کہ وہ کتنی شراب پینا چاہتا ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔21۔ میں ہے وَسَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا۔ اس میں ایک نکتہ قابل توجہ ہے۔ پہلے آیت۔5 میں ہے يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ (وہ لوگ پئیں گے ایک ایسے جام سے) اس کے بعد آیت۔17۔ میں فرمایا يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا (ان لوگوں کو پینے کے لیے دیا جائے گا اس میں ایک ایسے جام سے) اور یہاں ارشاد ہوا کہ سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ (پلائے گا ان کو ان کا رب)۔ عربیت کا ذوق رکھنے والے آسانی سے اس فرق کو سمجھ سکتے ہیں جو ان تینوں اسلوبوں یعنی يَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ، يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا اور سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ میں ہے۔ (تدبر قرآن) (فرق یہ ہے کہ شَرِبَ۔ يَشْرَبُ میں مفہوم یہ ہے کہ سامنے کسی چیز میں پینے کی کوئی چیز دیکھی یا کسی نہر یا دریا پر گزر رہا تو ہاتھ بڑھا کر خود پی لیا۔ جبکہ باب افعال میں اَسْقٰى۔ يُسْقِيْ کے معنی ہیں کسی کو پینے کی کوئی چیز دینا۔ يُسْقَوْنَ اس کا مضارع مجہول ہے۔ اس میں مفہوم یہ ہے کہ پینے کی چیز ان کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ اور ثلاثی مجرد میں سَقٰى۔ يَسْقِيْ کے معنی ہیں کسی کو پلانا، اس طرح سَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ میں مفہوم یہ ہے کہ ان کا رب خود ان کو پلائے گا۔ مرتب)

سوال یہ ہے کہ فرق کیوں ہے۔ شاید یہ اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ یہ ابرار درجہ بدرجہ قرب الٰہی کی منزلیں طے کرتے ہوئے اس مقام تک پہنچ جائیں گے کہ خودربِ کریم ان کو شراب طہور کا جام پلائے گا۔ یہ شراب طہور کیا ہے، اس کا تصور اس دنیا میں نہیں کیا جا سکتا۔ یہی

وجہ ہے کہ اس کے لیے قرآن نے کوئی اس طرح کا تمثیلی اسلوب اختیار نہیں کیا جس طرح کا اسلوب اوپر چشمہ کافور اور چشمۂ زنجبیل کے لیے 6940 اختیار فرمایا۔ اس کو صرف رب کریم ہی جانتا ہے۔ (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (23 تا 31)

ترجمہ

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ	الْقُرْاٰنَ	تَنْزِيْلًا ﴿٢٣﴾	فَاصْبِرْ
بیشک ہم نے ہی اتارا آپؐ پر	اس قرآن کو	جیسے جستہ جستہ اتارنے کا حق ہے	پس آپؐ ثابت قدم رہیں

لِحُكْمِ رَبِّكَ	وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ	اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴿٢٤﴾	وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ
اپنے رب کے حکم کے لیے (حقیقی حکم پر)	اور کہنا مت مانیں ان میں سے	کسی گنہگار کا یا کسی ناشکرے کا	اور آپؐ یاد کریں اپنے رب کے نام کو

بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿٢٥﴾	وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ	وَسَبِّحْهُ	لَيْلًا طَوِيْلًا ﴿٢٦﴾
صبح سویرے اور شام کے وقت	اور رات میں سے پھر آپؐ سجدہ کریں اس کو	اور آپ تسبیح کریں اس کی	طویل رات میں

اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ	الْعَاجِلَةَ	وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ	يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿٢٧﴾
بیشک یہ لوگ ہیں جو چاہتے ہیں	جلد حاصل ہونے والی (دنیا) کو	اور وہ چھوڑتے ہیں اپنے (پیٹھ) پیچھے	ایک بھاری دن (قیامت کی فکر) کو

نَحْنُ خَلَقْنٰهُمْ	وَشَدَدْنَآ	اَسْرَهُمْ ۚ	وَاِذَا شِئْنَا	بَدَّلْنَآ اَمْثَالَهُمْ
ہم نے ہی پیدا کیا ان کو	اور ہم نے مضبوط کیا	ان کی بندش (جوڑ بند) کو	اور جب بھی ہم چاہیں گے	ہم تبدیل کر دیں گے (ان کو) ان کے جیسوں سے

تَبْدِيْلًا ﴿٢٨﴾	اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۚ	فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ	سَبِيْلًا ﴿٢٩﴾
جیسے تبدیل کرتے ہیں	بیشک یہ ایک یاددہانی ہے	تو جو چاہے	وہ بنالے اپنے رب کی طرف	ایک راستہ

وَمَا تَشَآءُوْنَ	اِلَّآ اَنْ	يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ	اِنَّ اللّٰهَ كَانَ	عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿٣٠﴾
اور تم لوگ کیا چاہو گے	سوائے اس کے کہ جو	چاہے گا اللہ	بیشک اللہ ہے	جاننے والا حکمت والا

يُّدْخِلُ	مَنْ يَّشَآءُ	فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ
وہ داخل کرتا ہے	اس کو جس کو وہ چاہتا ہے	اپنی رحمت میں

وَالظّٰلِمِيْنَ	اَعَدَّ لَهُمْ	عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٣١﴾
اور ظلم (شرک) کرنے والوں کو	اس نے تیار کیا ان کے لیے	ایک دردناک عذاب

نوٹ: 1 آیت۔23 میں مخاطب بظاہر نبی ﷺ ہیں لیکن دراصل روئے سخن کفار کی طرف ہے کفار مکہ کہتے تھے کہ محمد (ﷺ) یہ قرآن خود سوچ سوچ کر بنا رہے ہیں، ورنہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی فرمان آتا تو اکٹھا ایک ہی مرتبہ آجاتا۔ قرآن میں بعض مقامات پر ان کا یہ اعتراض نقل کر کے اس کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اسے نقل کیے بغیر اللہ تعالیٰ نے پورے زور کے ساتھ فرمایا ہے کہ اس کے نازل کرنے والے ہم ہی ہیں یعنی محمد ﷺ اس کے مصنف نہیں ہیں۔ اور ہم ہی اس کو بتدریج نازل کر رہے ہیں۔ یہ ہماری حکمت کا تقاضہ ہے کہ اپنا پیغام بیک وقت ایک کتاب کی شکل میں نازل نہ کریں، بلکہ اسے تھوڑا

تھوڑا کر کے بھیجیں۔(تفہیم القرآن)۔

6940

نوٹ:2

آیت۔28 میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ انسان اپنے ایک ایک جوڑ پر نظر ڈالے کہ بتقاضائے حکمت وراحت انسانی جوڑ دیکھنے میں نرم ونازک معلوم ہوتے ہیں اور نرم نرم پٹھوں کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، جس کا طبعی تقاضا یہ تھا کہ سال دوسال ہی میں یہ جوڑوں کے بندھن اور اعصاب گھس جاتے اور ٹوٹ جاتے، خصوصاً جبکہ دن رات وہ حرکت میں رہتے ہیں اور موڑے تورے جاتے ہیں۔ اتنی شبانہ روز حرکت کے ساتھ تو لوہے کے اسپرنگ بھی سال دوسال میں گھس کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ ان نرم ونازک پٹھوں کو دیکھو کس طرح اعضاء کے جوڑوں کو باندھے ہوئے ہیں، نہ گھستے ہیں نہ ٹوٹتے ہیں۔ انسان اپنی انگلیوں کے جوڑوں کو دیکھے اور حساب لگائے کہ عمر بھر میں ان جوڑوں نے کتنی حرکتیں کی ہیں، کیسے کیسے زور آور دباؤ ان پر ڈالے گئے ہیں کہ اگر فولاد بھی ہوتا تو گھس گیا ہوتا مگر یہ جوڑ ہیں جو ستر اسی سال چلنے پر بھی اپنی جگہ قائم ہیں۔(معارف القرآن)۔

نوٹ:3

آیات۔29۔30۔ میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف جانے کا راستہ اختیار کرے۔ دوسرے یہ کہ تمہارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک اللہ نہ چاہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ بڑا حکیم وعلیم ہے۔ ان تینوں باتوں پر اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو انسان کی آزادئ اختیار اور اللہ کی مشیت کا تعلق بخوبی سمجھ میں آجاتا ہے اور وہ تمام الجھنیں صاف ہو جاتی ہیں جو تقدیر کے مسئلہ میں بالعموم لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کو جو اختیارات دیے گئے ہیں وہ صرف اس حد تک ہیں کہ یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے جو مختلف راستے اس کے سامنے آتے ہیں ان میں سے کسی کو اختیار کرنے کا فیصلہ کرے۔ یہ انتخاب کی آزادی (Freedom of Choice) ہے جو اللہ نے انسان کو دی ہے۔ مثلاً ایک آدمی کے سامنے اپنی روزی حاصل کرنے کا سوال جب آتا ہے تو اس کے سامنے بہت سے راستے ہوتے ہیں جن میں سے کچھ حلال ہیں اور کچھ حرام ہیں۔ ان میں کسی ایک راستے کو انتخاب کرنے کا فیصلہ انسان کے اپنے انتخاب پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اپنا رزق کس طریقے سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی طرح اخلاق کے مختلف ڈھنگ ہیں۔ اس کو پوری آزادی ہے کہ وہ اچھے بُرے جس ڈھنگ کے اخلاق اختیار کرنا چاہے کر لے۔ ایسا ہی معاملہ دین ومذہب کا ہے کہ اس میں بھی بہت سے راستے انسان کے سامنے کھلے ہوئے ہیں۔ الحاد اور انکار خدا، شرک وبت پرستی، شرک وتوحید کے مختلف مخلوطے، ایک وہ خالص خدا پرستی جس کی تعلیم قرآن دیتا ہے۔ یہ فیصلہ بھی انسان پر ہی چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ ان میں سے کس کو اختیار کرنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر جبراً اپنا کوئی فیصلہ نہیں ٹھونستا کہ وہ چاہتا تو ہو حلال روزی اور اللہ زبردستی اس کو حرام خور بنائے، یا وہ چاہتا تو ہو قرآن کی پیروی اور اللہ جبراً اسے ملحد یا مشرک یا کافر بنا دے۔

لیکن اس آزادئ انتخاب کے بعد یہ بات کہ انسان عملاً بھی وہی کچھ کر سکے جو وہ کرنا چاہتا ہے، اللہ کی مشیت اور اس کے اذن اور اس کی توفیق پر منحصر ہے۔ اگر اللہ کی مشیت یہ ہو کہ انسان کو وہ کام کرنے دے جس کے کرنے کی خواہش یا ارادہ یا فیصلہ اس نے کیا ہے، تب ہی وہ اس کو کر سکتا ہے ورنہ وہ چاہے کتنی بھی کوشش کر لے اللہ کے اذن کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ یہی بات دوسری بات میں فرمائی گئی ہے۔ اس معاملہ کو یوں سمجھئے کہ اگر دنیا میں انسان کو سارے اختیارات دے دیئے گئے ہوتے اور یہ بات اس کی مرضی پر چھوڑی گئی ہوتی کہ وہ جو کچھ بھی کرنا چاہے کر گزرے تو نظام عالم درہم برہم ہو جاتا۔ ایک قاتل دنیا کے تمام انسانوں کو قتل کر دینے کے لیے کافی تھا ایک جیب کترا دنیا کے کسی آدمی کی جیب سلامت نہ چھوڑتا، ایک ڈاکو سے کسی کا گھر نہ بچ سکتا اگر ان میں سے ہر ایک کو من مانی کرنے کے پورے اختیارات حاصل ہوتے۔ اس لیے یہ بات اللہ نے اپنے ہی اختیار میں رکھی ہے کہ انسان صحیح یا غلط جس راستے پر بھی جانا چاہے اس پر اسے چلنے دے۔

اس کے بعد تیسری بات اس غلط فہمی کو رفع کرتی ہے کہ اللہ کی یہ مشیت اَٹکل ٹپ (Arbitrary) نہیں ہے۔ وہ دانا ہے اور سب کچھ جانتا ہے وہ جو کچھ بھی کرتا ہے علم اور دانائی کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اپنے پورے علم اور پوری حکمت کے ساتھ یہ طے کرتا ہے کہ کس کو کیا توفیق دینی چاہیے اور کیا نہ دینی چاہیے۔ جس حد تک وہ انسان کو موقع دیتا ہے اور اسباب کو اس کے لیے سازگار بناتا ہے اسی حد تک وہ اپنی خواہش کے مطابق کام کرسکتا ہے خواہ وہ اچھا کام ہو یا برا ہو۔ ہدایت کا معاملہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے علم کی بنا پر جانتا ہے اور وہی اپنی حکمت کی بنا پر طے کرتا ہے کہ کون ہدایت کا مستحق ہے اور کون نہیں ہے (تفہیم القرآن۔ ج 6، ص 576۔577)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ المرسلٰت (77)

آیت نمبر (1 تا 28)

ك ف ت

(ض) كَفْتًا — کسی چیز کو جمع کر کے اپنے قبضہ میں لے لینا۔ سمیٹنا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 25۔

ش م خ

(ف) شَمْخًا — بلند ہونا۔

شَامِخَةٌ — اسم الفاعل کے وزن پر صفت ہے۔ بلند ہونے والی یعنی بلند۔ زیر مطالعہ آیت۔ 27۔

ترجمہ

وَالْمُرْسَلٰتِ	عُرْفًا ①	فَالْعٰصِفٰتِ	عَصْفًا ②
قسم ہے بھیجی جانے والیوں (ہواؤں) کی	بھلائی ہوتے ہوئے	پھر قسم ہے جھونکا دینے والیوں کی	جیسے جھونکا دیتے ہیں

وَّالنّٰشِرٰتِ	نَشْرًا ③	فَالْفٰرِقٰتِ	فَرْقًا ④	فَالْمُلْقِيٰتِ
اور قسم ہے پھیلانے والیوں کی	جیسے پھیلاتے ہیں	پھر قسم ہے الگ الگ کرنے والیوں کی	جیسے الگ الگ کرتے ہیں	پھر قسم ہے سامنے کرنے والیوں کی

ذِكْرًا ⑤	عُذْرًا اَوْ	نُذْرًا ⑥	اِنَّمَا	تُوْعَدُوْنَ
یاددہانی کو	عذر ختم کرنے کے لیے	یا خبردار کرنے کے لیے	کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	جو تم لوگوں سے وعدہ کیا جاتا ہے

لَوَاقِعٌ ⑦	فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ⑧	وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ⑨
یقیناً واقع ہونے والا ہے	پھر جب ستارے مٹا دیئے جائیں گے	اور جب آسمان میں شگاف ڈالے جائیں گے

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ⑩	وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ⑪	لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ⑫
اور جب پہاڑوں کو اکھاڑ کر اڑا دیا جائے گا	اور جب تمام رسول اکٹھا کیے جائیں گے	کس دن کے لیے مدت مقرر کی گئی

لِيَوْمِ الْفَصْلِ ⑬	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ⑭	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑮
فیصلہ کرنے کے دن کے لیے	اور تو کیا جانے کیا ہے فیصلہ کرنے کا دن	تباہی ہے جس دن جھٹلانے والوں کے لیے

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾	ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ	الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾	كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾
کیا ہم نے ہلاک نہیں کیا پہلوں کو	پھر ہم ان کے پیچھے بھیجتے ہیں	بعد والوں کو	اس کے جیسا ہی ہم کرتے ہیں مجرموں کے ساتھ

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾	اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾	فَجَعَلْنٰهُ
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کیا ہم نے پیدا نہیں کیا تم کو ایک حقیر پانی سے	پھر ہم نے رکھا اس (پانی) کو

فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾	اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾	فَقَدَرْنَا ۟ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾
ایک مضبوط ٹھکانے میں	ایک طے شدہ اندازے (مدت) تک	پھر ہم قابو یافتہ رہے

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾	اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾	اَحْيَآءً
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کیا ہم نے نہیں بنایا زمین سمیٹنے کے لیے	زندوں کو (اپنی پیٹھ پر)

وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾	وَّجَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ	وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾
اور مُردوں کو (اپنے پیٹ میں)	اور ہم نے بنائے اس میں اونچے پہاڑ	اور ہم نے پینے کے لیے دیا تم کو شیریں پانی

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

نوٹ: 1

اس سورت میں حق تعالیٰ نے چند چیزوں کی قسمیں کھا کر قیامت کے یقینی طور آنے کا ذکر فرمایا ہے۔ ان چیزوں کا نام بیان کرنے کے بجائے ان کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ مرسلات۔ عاصفات۔ ناشرات۔ فارقات اور ملقیت الذکر۔ کسی حدیث میں بھی یہ تعین نہیں ہے کہ یہ کن چیزوں کی صفات ہیں۔ اس لیے صحابہ اور تابعین کی تفسیریں اس معاملہ میں مختلف ہوگئیں۔ بعض حضرات نے ان پانچوں صفات کا موصوف فرشتوں کو قرار دیا ہے۔ جبکہ بعض حضرات نے ان کا موصوف انبیاء ورسل کو قرار دیا ہے۔ ابن کثیرؒ نے فرمایا کہ شروع کی تین صفات ہواؤں کے لیے ہیں۔ ان تین میں ہواؤں کی قسم ہے۔ باقی دو صفتیں فرشتوں کے لیے ہیں تو یہ فرشتوں کی قسم ہے۔ (معارف القرآن)

نوٹ: 2

ان آیات میں بارش لانے والی ہواؤں کی ترتیب یہ بیان کی گئی کہ پہلے پے در پے ہوائیں چلتی ہیں، پھر آندھی کی شکل اختیار کر لیتی ہیں، پھر بادلوں کو اٹھا کر پھیلاتی ہیں، پھر انہیں پھاڑ کر جدا کرتی ہیں۔ اس کے بعد بارش کے نزول کا ذکر کرنے کے بجائے یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی یاد دلوں میں ڈالتی ہیں، عذر کے طور پر اگر ایک مدت تک بارش نہ ہوئی ہو اور لوگ پانی کے قطرے قطرے کو ترس رہے ہوں تو اس موقع پر کٹے سے کٹا کافر بھی خدا کو یاد کرنے لگتا ہے۔ اگر معمولی قحط ہو تو عام آدمی جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ دور نہیں ہے، وہ تو اللہ کو یاد کرے گا۔ لیکن دوسرے لوگ (یعنی اعلیٰ تعلیم یافتہ دانشور لوگ) سائنس بگھاریں گے اور کہیں گے کہ گھبرانے کی بات نہیں ہے، فلاں فلاں اسباب سے بارش نہیں ہو رہی ہے، اتنی سی بات پر دعائیں مانگنے لگنا ضعیف الاعتقادی ہے۔ البتہ اگر طویل مدت تک قحط برپا رہے تو بڑے سے بڑے کافر کو خدا یاد آنے لگتا ہے۔ اور خدا سے دعا مانگتے ہیں کہ جو ہوائیں بادل اٹھا کر لا رہی ہیں ان سے پورے ملک میں بارش ہو جائے۔ یہ ہے عذر کے طور پر دلوں میں خدا کی یاد کا القاء۔ رہا نُذُرًا (ڈراوے) کے طور پر اس کا القاء تو یہ اس وقت ہوتا ہے جب آندھی طوفانِ عظیم بن جائے یا بارش اس قدر زور دار ہو کہ سیلاب بلا بن جائے اپنے وقت میں مضبوط سے مضبوط دل کا منکر بھی خدا کے آگے گڑگڑانے لگتا ہے اور اس وقت طوفان یا سیلاب کی ساری سائنٹیفیک توجیہات اس کے نہاں خانۂ دماغ سے فرار اختیار کر جاتی ہیں۔ (تفہیم القرآن۔ ج6 ص579)

1940

آیت نمبر (29 تا 50)

ل	ھ	ب

(ف) لَهَبًا — آگ کا بھڑکنا۔

لَهَبٌ — آگ کا شعلہ، بلند غبار۔ زیر مطالعہ آیت۔ 31۔

ترکیب

(آیت۔ 36) وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ فَيَعْتَذِرُوْنَ میں نون اعرابی کی موجودگی بتا رہی ہے کہ اس کا فاسببیہ نہیں ہے۔ اگر یہ فاسببیہ ہوتا تو فَيَعْتَذِرُوْا آتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ فَا عاطفہ ہے جو لَا يُؤْذَنُ پر عطف ہے۔ ترجمہ میں اس کا لحاظ کرنا ہوگا۔ فاسببیہ کے طور پر جو ترجمے کیے گئے ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ (حافظ احمد یار صاحب مرحوم)

ترجمہ

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى مَا	كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ج	اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ
تم لوگ چلو اس کی طرف	تم لوگ جھٹلایا کرتے تھے جس کو	تم لوگ چلو ایک ایسے سائے کی طرف جو

ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾لا	لَّا ظَلِيْلٍ	وَّلَا يُغْنِيْ	مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ط	اِنَّهَا تَرْمِيْ
تین شاخوں والا ہے	جو نہ گھنی چھاؤں ہے	اور جو فائدہ نہیں پہنچائے گا	آگ کی لپٹ سے	بیشک وہ (آگ) پھینکتی ہے

بِشَرَرٍ	كَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ج	كَاَنَّهٗ	جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ط	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۴﴾
ایسی چنگاریاں جو	محل کے مانند ہیں	جیسے کہ وہ (چنگاریاں)	زرد اونٹ ہوں	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

هٰذَا يَوْمُ لَا يَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾لا	وَلَا يُؤْذَنُ لَهُمْ	فَيَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۳۷﴾
یہ ان کے نہ بول سکنے کا دن ہے	اور نہ اجازت دی جائے گی ان کو	پس وہ معذرت نہ کرسکیں گے	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ ج	جَمَعْنٰكُمْ وَالْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾	فَاِنْ كَانَ لَكُمْ كَيْدٌ	فَكِيْدُوْنِ ﴿۳۹﴾
یہ فیصلہ کرنے کا دن ہے	ہم نے جمع کیا تم کو اور پہلوں کو	پھر اگر ہے تمہاری کوئی چالبازی	تو تم لوگ چالبازی کرو مجھ سے

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۰﴾ع	اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ	فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۴۱﴾لا
تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	یقیناً متقی لوگ	سایوں اور چشموں میں ہوں گے

وَّفَوَاكِهَ	مِمَّا يَشْتَهُوْنَ ﴿۴۲﴾ط	كُلُوْا وَاشْرَبُوْا	هَنِيْٓئًا بِمَا	كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾
اور پھلوں میں	اس میں سے جو وہ چاہیں گے	تم لوگ کھاؤ اور پیو	خوشگوار ہوتے ہوئے بسبب اس کے جو	تم لوگ عمل کیا کرتے تھے

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي	الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۴۴﴾	وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۵﴾	كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا
بیشک ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں	خوب کاروں کا	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	کھالو اور برت لو تھوڑا عرصہ

اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۴۶﴾	وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۷﴾	وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ
بیشک تم لوگ مجرم ہو	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے	اور جب کہا جاتا ہے ان سے

ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ ﴿۴۸﴾	وَيْلٌ يَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۴۹﴾
تم لوگ رکوع کرو تو وہ رکوع نہیں کرتے	تباہی ہے اس دن جھٹلانے والوں کے لیے

فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ	بَعْدَهٗ	يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۰﴾ ع
تو (اب) کس بات پر	اس (قرآن) کے بعد	وہ لوگ ایمان لائیں گے

نوٹ: 1

آیت۔35۔36 میں ایک ایسے دن کا ذکر ہے جب کافر لوگ نہ بول سکیں گے نہ کوئی عذر پیش کریں گے۔ یہ ان کی آخری حالت ہوگی جو جہنم میں داخلہ کے وقت ان پر طاری ہوگی۔ اس سے پہلے میدان حشر میں تو یہ لوگ بہت کچھ کہیں گے، بہت سی معذرتیں پیش کریں گے، ایک دوسرے پر اپنے قصوروں کا الزام ڈال کر خود بے قصور بننے کی کوشش کریں گے، اپنے گمراہ کرنے والے سرداروں اور پیشواؤں کو گالیاں دیں گے حتیٰ کہ بعض لوگ پوری ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جرائم کا انکار تک کر گزریں گے جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان ہوا ہے۔ مگر جب تمام شہادتوں سے ان کا مجرم ہونا ثابت کر دیا جائے گا اور جب ان کے ہاتھ پاؤں اور ان کے اعضاء تک ان کے خلاف گواہی دے کر ثبوت جرم میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے تو ان کے لیے اپنی معذرت میں کچھ کہنے کی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ عذر پیش کرنے کی اجازت نہ دینے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صفائی کا موقع دیئے بغیر ان کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جائے گا۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جرم اس طرح قطعی حد تک ثابت کر دیا جائے گا کہ ان کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہے گی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ہم کہتے ہیں کہ میں نے اس کو بولنے نہیں دیا یا میں نے اس کی زبان (بولتی) بند کر دی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں نے اس پر ایسی حجت تمام کی کہ اس کے لیے زبان کھولنے کا کوئی موقع باقی نہ رہا۔ (تفہیم القرآن)

6940

6940

6940

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

1973

سورۃ النبا(78)

آیت نمبر(1تا16)

و ھ ج

(ض) وَھْجًا آگ یا سورج کا روشن ہونا۔

وَھَّاجٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے۔خوب روشن ہونے والا۔زیر مطالعہ آیت۔13۔

ث ج ج

(ن) ثُجُوْجًا پانی کا زور سے بہنا یا برسنا۔

ثَجَّاجٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ ہے بہت زور سے بہنے والا یا برسنے والا۔زیر مطالعہ آیت۔14۔

ترجمہ

عَمَّ	یَتَسَآءَلُوۡنَ ۚ﴿۱﴾	عَنِ النَّبَاِ الۡعَظِیۡمِ ۙ﴿۲﴾	الَّذِیۡ ہُمۡ فِیۡہِ
کس چیز کے بارے میں	یہ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں	اُس عظیم خبر کے بارے میں؟	وہ، یہ لوگ جس میں

مُخۡتَلِفُوۡنَ ؕ﴿۳﴾	کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ۙ﴿۴﴾	ثُمَّ	کَلَّا سَیَعۡلَمُوۡنَ ﴿۵﴾
اختلاف کرنے والے ہیں	ہرگز نہیں! یا یہ لوگ جان لیں گے	پھر (مکرر)	ہرگز نہیں! یہ لوگ جان لیں گے

اَلَمۡ نَجۡعَلِ الۡاَرۡضَ	مِہٰدًا ۙ﴿۶﴾	وَّ الۡجِبَالَ اَوۡتَادًا ۪ۙ﴿۷﴾
کیا ہم نے نہیں بنایا زمین کو	آرام دہ ٹھکانہ	اور پہاڑوں کو میخیں

وَّ خَلَقۡنٰکُمۡ اَزۡوَاجًا ۙ﴿۸﴾	وَّ جَعَلۡنَا نَوۡمَکُمۡ	سُبَاتًا ۙ﴿۹﴾	وَّ جَعَلۡنَا الَّیۡلَ
اور ہم نے پیدا کیے تم لوگوں کو جوڑے جوڑے	اور ہم نے بنایا تمہاری نیند کو	آرام کے لیے	اور ہم نے بنایا رات کو

لِبَاسًا ۙ﴿۱۰﴾	وَّ جَعَلۡنَا النَّہَارَ	مَعَاشًا ۪﴿۱۱﴾	وَّ بَنَیۡنَا فَوۡقَکُمۡ
ایک پردہ	اور ہم نے بنایا دن کو	زندگی گزارنے کا وقت	اور ہم نے بنائے تمہارے اوپر

سَبۡعًا شِدَادًا ۙ﴿۱۲﴾	وَّ جَعَلۡنَا سِرَاجًا وَّہَّاجًا ۪ۙ﴿۱۳﴾	وَّ اَنۡزَلۡنَا مِنَ الۡمُعۡصِرٰتِ
سات مضبوط (آسمان)	اور ہم نے بنایا ایک بہت روشن چراغ	اور ہم نے اتارا بدلیوں میں سے

مَآءً ثَجَّاجًا ۙ﴿۱۴﴾	لِّنُخۡرِجَ بِہٖ	حَبًّا وَّ نَبَاتًا ۙ﴿۱۵﴾	وَّ جَنّٰتٍ اَلۡفَافًا ﴿ؕ۱۶﴾
موسلادھار پانی	تاکہ ہم نکالیں اس سے	دانے اور سبزہ	اور کچھ گھنے باغات

نوٹ:1 عَمَّ دراصل دو حرفوں عن اور ما سے مرکب ہے۔حرف مَا استفہام کے لیے آتا ہے۔اس ترکیب میں حرف مَا سے الف ساقط کر دیا جاتا ہے۔

6973

معنی ہوئے جس چیز کے بارے میں (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

مکہ معظّمہ میں جب اوّل اوّل رسول اللہ ﷺ نے اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا تو اس کی بنیاد تین چیزیں تھیں۔ایک یہ بات کہ اللہ کے ساتھ کسی کو خدائی میں شریک نہ مانا جائے۔دوسری یہ کہ آپ ﷺ کو اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے۔تیسری یہ کہ اس دنیا کا ایک روز خاتمہ ہو جائے گا اور اس کے بعد ایک دوسرا عالم برپا ہوگا جس میں تمام اولین و آخرین دوبارہ زندہ کر کے اسی جسم کے ساتھ اٹھائے جائیں گے جس میں رہ کر انہوں نے اس دنیا میں کام کیا تھا۔پھر ان کے عقائد اور اعمال کا حساب لیا جائے گا۔اس محاسبہ میں جو لوگ مومن اور صالح ثابت ہوں گے وہ ہمیشہ کے لیے جنت میں جائیں گے اور جو کافر و فاسق ہوں گے وہ دوزخ میں جائیں گے۔

ان میں سے پہلی بات اگرچہ اہل مکہ کو سخت ناگوار تھی،لیکن بہرحال وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کے منکر نہ تھے،اس کے رب اعلیٰ اور خالق و رازق ہونے کو بھی مانتے تھے اور یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ دوسری جن جن ہستیوں کو وہ معبود قرار دیتے ہیں وہ اللہ ہی کی مخلوق ہیں۔اس لیے جھگڑا صرف اس بات میں تھا کہ خدا کی خدائی میں ان ہستیوں کی کوئی شرکت ہے یا نہیں۔دوسری بات کو مکہ کے لوگ ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔لیکن اس امر سے انکار کرنا ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ چالیس سال تک جو زندگی آپ ﷺ نے ان کے درمیان گزاری تھی اس میں انہوں نے کبھی آپ ﷺ کو جھوٹا یا فریب کار یا مطلبی نہ پایا تھا۔اس لیے ہزار بہانے اور الزامات تراشنے کے باوجود انہیں دوسروں کو باور کرانے اور خود باور کرنے میں سخت مشکل پیش آ رہی تھی کہ حضور ﷺ سارے معاملات میں تو راستباز ہیں اور صرف رسالت کے دعوے میں معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔

اس طرح پہلی دو باتیں اہل مکہ کے لیے اتنی زیادہ الجھن کا باعث نہ تھیں جتنی تیسری بات تھی۔انہوں نے سب سے زیادہ اسی کا مذاق اڑایا،سب سے زیادہ حیرانی اور تعجب کا اظہار کیا اور اسے بالکل بعید از عقل اور ناممکن سمجھ کر جگہ جگہ اس کے ناقابل تصور ہونے کے چرچے شروع کر دیئے۔مگر ان لوگوں کو اسلام کی راہ پر لانے کے لیے یہ قطعی ناگزیر تھا کہ آخرت کا عقیدہ ان کے ذہن میں اتارا جائے کیونکہ اس عقیدے کو مانے بغیر یہ ممکن ہی نہ تھا کہ حق اور باطل کے معاملہ میں ان کا طرز فکر سنجیدہ ہو سکتا،خیر و شر کے معاملہ میں ان کا معیار بدل سکتا اور دنیا پرستی کی راہ چھوڑ کر اس راہ پر ایک قدم بھی چل سکتے جس پر اسلام ان کو چلانا چاہتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ مکہ معظّمہ کے ابتدائی دور کی سورتوں میں زیادہ تر زور آخرت کا عقیدہ دلوں میں بٹھانے پر صرف کیا گیا ہے۔البتہ اس کے لیے دلائل ایسے انداز سے دیئے گئے ہیں جن سے توحید کا تصور بھی خود بخود ذہن نشین ہوتا چلا جاتا ہے اور بیچ بیچ میں رسول اللہ ﷺ اور قرآن کے برحق ہونے کے دلائل بھی مختصراً دے دیے گئے ہیں۔اس لیے اس دور کی سورتوں میں سورۂ قیامہ سے نازعات تک) آخرت کے مضمون کی تکرار زیادہ ہے۔(تفہیم القرآن۔ج۶۔ص:۲۲۰۔۲۲۱)

نوٹ:3

آیت۔9۔میں حق تعالیٰ نے انسان کی راحت کے سب سامانوں میں سے خاص طور پر نیند کا ذکر فرمایا ہے۔غور کیجئے تو یہ ایک عظیم الشان نعمت ہے۔اور اس نعمت کو حق تعالیٰ نے پوری مخلوق کے لیے ایسا عام فرما دیا ہے کہ امیر،غریب،عالم،جاہل،بادشاہ اور مزدور سب کو یہ دولت بیک وقت عطا ہوتی ہے۔بلکہ دنیا کے حالات کا تجزیہ کریں تو غریبوں اور محنت کشوں کو یہ نعمت جیسی حاصل ہوتی ہے وہ مالداروں اور دنیا کے بڑوں کو نصیب نہیں ہوتی۔نیند کی نعمت گدوں،تکیوں یا کوٹھی بنگلوں کی فضا کے تابع نہیں ہے،یہ تو حق تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جو براہِ راست اس کی طرف سے ملتی ہے۔بعض اوقات مفلس کو بغیر کسی بستر تکیے کے،کھلی زمین پر یہ نعمت فراوانی سے دے دی جاتی

ہے اور بعض اوقات ساز و سامان والوں کو نہیں دی جاتی، ان کو خواب آور گولیاں کھا کر حاصل ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ گولیاں بھی کام نہیں کرتیں۔ پھر غور کرو کہ حق تعالیٰ نے ساری مخلوق کو یہ نعمت مفت اور بلا محنت دی ہے۔ پھر اس سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اس نے اپنی رحمت کاملہ سے اس نعمت کو جبری بنا دیا ہے۔ انسان بعض اوقات کام کی کثرت سے مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ رات بھر جاگتا رہے مگر رحمت حق اس پر جبراً نیند مسلط کر کے اس کو سلا دیتی ہے کہ دن بھر کی تھکان دور ہو جائے اور اس کے قویٰ مزید کام کے لیے تیز ہو جائیں۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 4

آیت۔13۔ میں روشن چراغ سے مراد سورج ہے۔ اس مختصر سے فقرے میں اللہ تعالیٰ کی قدرت و حکمت کے جس عظیم الشان نشان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اس کا قطر زمین کے قطر سے ۱۰۹ گنا اور حجم زمین کے حجم سے ۱۳ لاکھ ۳۳ ہزار گنا زیادہ بڑا ہے۔ اس کا درجۂ حرارت ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈگری سنٹی گریڈ ہے۔ زمین سے ۹ کروڑ تیس لاکھ میل دور ہونے کے باوجود اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ انسان اگر برہنہ آنکھ سے اس کی طرف نظر جمانے کی کوشش کرے تو اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ یہ اللہ ہی کی حکمت ہے کہ اس نے زمین کو اس سے ٹھیک اتنے فاصلے پر رکھا ہے کہ نہ اس سے بہت قریب ہونے کے باعث اتنا گرم ہے اور نہ بہت دور ہونے کے باعث بے انتہا سرد۔ اسی وجہ سے یہاں انسان، حیوان اور نباتات کی زندگی ممکن ہوئی ہے۔ اسی سے قوت کے بے حساب خزانے نکل کر زمین پر پہنچ رہے ہیں۔ اسی سے فصلیں پک رہی ہیں اور ہر مخلوق کو غذا پہنچ رہی ہے۔ اسی کی حرارت سمندروں کے پانی کو گرم کر کے وہ بھاپیں اٹھاتی ہے جو ہواؤں کے ذریعہ سے زمین کے مختلف حصوں میں پھیلی اور بارش کی شکل میں برستی ہیں۔ اس سورج میں اللہ تعالیٰ نے ایسی زبردست بھٹی سلگا رکھی ہے جو اربوں سال سے روشنی، حرارت اور مختلف اقسام کی شعاعیں سارے نظام شمسی میں پھینکے جا رہی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

آیت نمبر (17 تا 30)

اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ	كَانَ مِيْقَاتًا ﴿۱۷﴾	يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ	فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا ﴿۱۸﴾
یقیناً فیصلے کا دن	ہے ایک طے شدہ وقت	جس دن پھونکا جائے گا صور میں	تو تم لوگ آؤ گے فوج در فوج
وَّفُتِحَتِ السَّمَآءُ	فَكَانَتْ اَبْوَابًا ﴿۱۹﴾	وَّسُيِّرَتِ الْجِبَالُ	فَكَانَتْ سَرَابًا ﴿۲۰﴾
اور کھولا جائے گا آسمان	تو وہ ہوگا دروازے دروازے	اور چلایا جائے گا پہاڑوں کو	تو وہ ہوں گے چمکتی ریت
اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ﴿۲۱﴾	لِّلطّٰغِيْنَ مَاٰبًا ﴿۲۲﴾	لّٰبِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا ﴿۲۳﴾	
بیشک جہنم ہے گھات لگانے کا مستقل ٹھکانہ	سرکشی کرنے والوں کے لیے واپس ہونے کی جگہ ہوتے ہوئے	رہنے والے ہوتے ہوئے اس میں مدتوں	
لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا	بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا ﴿۲۴﴾	اِلَّا حَمِيْمًا وَّغَسَّاقًا ﴿۲۵﴾	
وہ لوگ نہیں چکھیں گے اس میں	کوئی ٹھنڈک اور نہ کوئی پینے کی چیز	سوائے گرم پانی اور پیپ کے	
جَزَآءً وِّفَاقًا ﴿۲۶﴾	اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا ﴿۲۷﴾	وَّكَذَّبُوْا	
جیسے کا تیسا بدلہ ہوتے ہوئے	بیشک یہ لوگ توقع نہیں کیا کرتے تھے کسی محاسبہ کی	اور انہوں نے جھٹلایا ہماری نشانیوں کو	
بِاٰيٰتِنَا كِذَّابًا ﴿۲۸﴾	وَكُلَّ شَيْءٍ	اَحْصَيْنٰهُ	كِتٰبًا ﴿۲۹﴾
بہت زیادہ جھٹلاتے ہوئے	اور ہر چیز کو	ہم نے احاطہ کیا اس کا	بطور لکھی ہوئی ہونے کے

فَذُوْقُوْا	فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ	اِلَّا عَذَابًا ﴿۳۰﴾
		6973
پس تم لوگ چکھو	تو ہم ہرگز زیادہ نہیں کریں گے تم کو	مگر بلحاظ عذاب کے

نوٹ:1

یَوْمَ الْفَصْلِ سے مراد قیامت ہے۔ وہ ایک وقت اور متعین حد ہے جس پر یہ دنیا ختم ہو جائے گی جبکہ صور پھنکا جائے گا۔ اور دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ نفخ صور دو مرتبہ ہوگا۔ پہلے نفخہ سے سارا عالم فنا ہو جائے گا اور دوسرے نفخہ سے پھر زندہ و قائم ہو جائے گا۔ اس دوسرے نفخہ کے وقت سارے عالم کے اگلے پچھلے انسان اپنے رب کے سامنے فوج در فوج ہو کر حاضر ہوں گے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ قیامت کے روز تین فوجوں میں تقسیم ہوں گے۔ ایک فوج ان لوگوں کی ہوگی جو پیٹ بھرے ہوئے لباس پہنے ہوئے سواریوں پر سوار میدان حشر میں آئیں گے، دوسری فوج پیادہ لوگوں کی ہوگی جو چل کر میدان میں آئیں گے اور تیسری فوج ان لوگوں کی ہوگی جن کو چہروں کے بل گھسیٹ کر میدان حشر میں لایا جائے گا۔ بعض روایات میں افواج کی تشریح دس قسم کی افواج سے کی گئی ہے اور بعض حضرات نے فرمایا کہ حاضرین محشر کی بے شمار جماعتیں اپنے اپنے اعمال کے اعتبار سے ہوں گی۔ ان اقوال میں کوئی تضاد نہیں، سب جمع ہو سکتے ہیں، (معارف القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔23۔ میں ہے کہ وہ لوگ اس میں مدتوں رہنے والے ہیں۔ مدتوں کے لیے لفظ احقاب استعمال کیا گیا ہے (یہ جمع الجمع ہے۔ اس کا واحد حُقْبٌ ہے۔ اس کی جمع حُقُبٌ ہے اور اس کی جمع اَحْقَابٌ ہے۔ مرتب) جس کے معنی ہیں پے در پے آنے والے طویل زمانے۔ اس لفظ سے بعض لوگوں نے یہ استدلال کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنت کی زندگی میں تو ہمیشگی ہوگی مگر جہنم میں ہمیشگی نہیں ہوگی کیونکہ یہ مدتیں خواہ کتنی ہی طویل ہوں لیکن بہرحال کبھی نہ کبھی جا کر ختم ہو جائیں گی۔ لیکن یہ استدلال دو وجوہ سے غلط ہے۔ ایک یہ کہ عربی لغت کے لحاظ سے حقب کے لفظ ہی میں یہ مفہوم شامل ہے کہ ایک حقب کے پیچھے دوسرا حقب ہو۔ اس لیے احقاب لازماً ایسے ادوار ہی کے لیے بولا جائے گا جو پے در پے ایک دوسرے کے بعد آتے چلے جائیں اور کوئی دور بھی ایسا نہ ہو جس کے پیچھے دوسرا دور نہ آئے۔ دوسرے یہ کہ کسی موضوع کے متعلق قرآن مجید کی کسی آیت سے کوئی ایسا مفہوم لینا اصولاً غلط ہے جو اسی موضوع کے بارے میں قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہو۔ قرآن میں ۳۴ مقامات پر اہل جہنم کے لیے خلود (ہمیشگی) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ ایک جگہ صاف صاف ارشاد ہوا ہے کہ وہ چاہیں گے کہ جہنم سے نکل جائیں مگر وہ اس سے ہرگز نکلنے والے نہیں ہیں۔ (المائدۃ۔37) ان تصریحات کے بعد لفظ احقاب کی بنیاد پر یہ کہنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ جہنم میں خدا کے باغیوں کا قیام دائمی نہیں ہوگا۔ (تفہیم القرآن)۔

یہ بات اس لیے بھی غلط ہے کہ زبان سمجھنے کا طریقہ یہ ہے کہ مجمل کی شرح مفصل کی روشنی میں کرتے ہیں نہ کہ مفصل کی شرح مجمل کی روشنی میں۔ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا کے الفاظ ظاہر ہے کہ مفصل ہیں اور لفظ اَحْقَابٌ مجمل ہے۔ اس مجمل کو مفصل کی روشنی میں سمجھیں گے نہ کہ اس کے برعکس (تدبر قرآن)۔

آیت نمبر (31 تا 40)

6973

د	ہ	ق

(ف) دَهْقًا پیالہ بھرنا۔ پانی کو زور سے گرانا۔
دِهَاقَ لبالب بھرا ہوا پیالہ۔ زیر مطالعہ آیت۔34۔

ترکیب

(آیت۔31) مَفَازًا مبتدا مؤخر نکرہ ہے اور اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہے۔ اس کی خبر محذوف ہے جو مَوْجُوْدٌ ہو سکتی ہے۔ لِلْمُتَّقِيْنَ قائم مقام خبر مقدم ہے۔ (آیت۔23 تا 34)۔ ان آیات کے الفاظ سابقہ آیت کے اِنَّ پر عطف ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں، (آیت۔35)۔ لَغْوًا اور كِذَّابًا، لَا يَسْمَعُوْنَ کا مفعول ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔36)۔ جَزَاءً اور عَطَاءً حِسَابًا حال ہونے کی وجہ سے حالت نصب میں ہیں۔ (آیت۔37) اس آیت میں رَبِّ اور اَلرَّحْمٰنِ، یہ دونوں گزشتہ آیت کے رَبِّكَ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالت جر میں ہیں۔ (آیت۔40) اَلْمَرْءُ اور اَلْكَافِرُ دونوں پر لام جنس ہے۔

ترجمہ

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ	مَفَازًا ﴿٣١﴾	حَدَآئِقَ وَاَعْنَابًا ﴿٣٢﴾
یقیناً متقی لوگوں ہی کے لیے	مراد پانے کی ایک جگہ ہے	باغیچے ہیں اور انگور ہیں
وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا ﴿٣٣﴾	وَّكَاْسًا دِهَاقًا ﴿٣٤﴾	لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا
اور نوخیز ہم جولیاں ہیں	اور چھلکتے جام ہیں	وہ لوگ نہیں سنیں گے اس میں
لَغْوًا وَّلَا كِذّٰبًا ﴿٣٥﴾	جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ	عَطَآءً حِسَابًا ﴿٣٦﴾
کوئی بے سود بات اور نہ کوئی جھوٹ	بدلہ ہوتے ہوئے آپؐ کے رب (کی طرف) سے	حساب کی ہوئی بخشش ہوتے ہوئے
رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	وَمَا بَيْنَهُمَا	الرَّحْمٰنِ
جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے	اور اس کا جو ان دونوں کے درمیان ہے	جو انتہائی رحمت والا ہے

لَا يَمْلِكُوْنَ مِنْهُ خِطَابًا ﴿٣٧﴾	يَوْمَ يَقُوْمُ	الرُّوْحُ وَالْمَلٰٓئِكَةُ	صَفًّا
لوگ اختیار نہیں رکھتے اس سے خطاب کرنے کا	جس دن کھڑے ہوں گے	وہ روح (جبریلؑ) اور سارے فرشتے	صف بنائے ہوئے

لَّا يَتَكَلَّمُوْنَ اِلَّا مَنْ	اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ	وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾	ذٰلِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ
لوگ بول نہیں پائیں گے سوائے اس کے	اجازت دے گا جس کے لیے رحمٰن	اور وہ کہے گا بے لاگ بات	یہ ہوگا وہ برحق دن

فَمَنْ شَآءَ	اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا ﴿٣٩﴾	اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ
تو (اب) جس کا جی چاہے	وہ بنا لے اپنے رب کی طرف واپس ہونے کی ایک جگہ	بیشک ہم نے خبردار کر دیا تم لوگوں کو
عَذَابًا قَرِيْبًا ۙ	يَّوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ	مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ
ایک قریبی عذاب سے	جس دن دیکھ لے گا ہر آدمی	اس کو جو آگے بھیجا اس کے دونوں ہاتھوں کو

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ	يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا ﴿40﴾ 6973
اور کہے گا ہر کافر	اے کاش میں ہوتا کوئی مٹی

نوٹ:1

آیت۔36۔کا مطلب یہ ہے کہ اوپر جنت کی جن نعمتوں کا ذکر آیا ہے یہ جزاء ہے مومنین کے لیے اور عطاء ہے ان کے رب کی طرف سے یہاں ان نعمتوں کو پہلے جزائے اعمال بتلایا گیا پھر عطائے ربانی۔ بظاہر ان دونوں میں تضاد ہے۔ جزاء اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے بدلے میں ہو۔ اور عطاء وہ ہے جو بلا کسی بدلے کے بطور انعام ہو۔ قرآن کریم نے ان دونوں لفظوں کو ایک جگہ جمع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جنت میں داخل ہونا اور اس کی نعمتیں صرف صورت اور ظاہر کے اعتبار سے اہل جنت کے اعمال کی جزاء ہے لیکن حقیقت کے اعتبار سے وہ خالص عطائے ربانی ہے، کیونکہ انسانی اعمال تو ان نعمتوں کا بھی بدلہ نہیں بن سکتے جو ان کو دنیا میں دے دی گئیں۔ اس لیے آخرت میں نعمتوں کا ملنا تو صرف حق تعالیٰ کا انعام اور عطائے محض ہے۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے عمل سے جنت میں نہیں جا سکتا جب تک حق تعالیٰ کا فضل نہ ہو۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں میں بھی اپنے عمل سے جنت میں نہیں جا سکتا۔

لفظ حِسَابًا کے دو معنی کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ایسی عطاء جو اس کی تمام ضرورتوں کے لیے کافی ہو۔ اور لفظ کے دوسرے معنی حساب کے موازنہ اور مقابلہ کے لیے بھی آتے ہیں۔ اس معنی میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ عطائے ربانی اہل جنت پر ان کے اعمال کے حساب سے مبذول ہوگی۔ اس عطاء میں درجات بحساب اخلاص اور احسانِ عمل کے ہوں گے جیسا کہ احادیث میں صحابہ کرامؓ کے اعمال کا درجہ باقی امت کے اعمال کے مقابلے میں یہ قرار دیا ہے کہ صحابی اگر اللہ کی راہ میں ایک مد یعنی ایک سیر خرچ کرے اور غیر صحابی اُحد پہاڑ کے برابر خرچ کرے تو صحابی کا ایک مُد اس پہاڑ سے بڑھا ہوا رہے گا۔ (معارف القرآن)

مورخہ ۲۳۔ جمادی الثانی ۱۴۳۱ھ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورۃ النّٰزِعٰتِ (79)

آیت نمبر (1 تا 14)

ن ش ط

(ض۔ن) نَشْطًا گرہ کھولنا۔ گرہ لگانا۔ بند کھولنا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

نَاشِطَةٌ اسم الفاعل ہے۔ بند کھولنے والی۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

ن خ ر

(س) نَخَرًا بوسیدہ ہو کر ریزہ ریزہ ہونا۔

نَخِرَةٌ صفت ہے۔ ریزہ ریزہ۔ بُھر بُھری۔ زیر مطالعہ آیت۔ 11۔

س ھـ ر

6973

سَهَرًا رات بھر جاگتے رہنا۔

سَاهِرَةٌ رات بھر جاگنے والی۔ پھر اس سے مراد لیتے ہیں سطح زمین۔ میدان۔ زیر مطالعہ آیت۔14۔

ترجمہ

وَالنّٰزِعٰتِ	غَرْقًا ۙ﴿۱﴾	وَّالنّٰشِطٰتِ	نَشْطًا ۙ﴿۲﴾
قسم ہے کھینچ نکالنے والیوں کی	ڈوب کر	اور بند کھولنے والیوں کی	جیسے کھولنے کا حق ہے

وَّالسّٰبِحٰتِ	سَبْحًا ۙ﴿۳﴾	فَالسّٰبِقٰتِ	سَبْقًا ۙ﴿۴﴾	فَالْمُدَبِّرٰتِ
اور تیرنے والیوں کی	جیسے تیرتے ہیں	پھر سبقت کرنے والیوں کی	جیسے سبقت کرتے ہیں	پھر تدبیر کرنے والیوں کی

اَمْرًا ۘ﴿۵﴾	يَوْمَ تَرْجُفُ	الرَّاجِفَةُ ۙ﴿۶﴾	تَتْبَعُهَا	الرَّادِفَةُ ؕ﴿۷﴾
کسی (بھی) حکم کے لیے	جس دن لرزے گی	وہ لرزنے والی	اس کے پیچھے آئے گی	وہ پیچھے لگنے والی

قُلُوْبٌ يَّوْمَئِذٍ	وَّاجِفَةٌ ۙ﴿۸﴾	اَبْصَارُهَا	خَاشِعَةٌ ۘ﴿۹﴾	يَقُوْلُوْنَ
کچھ دل اس دن	مضطرب ہونے والے ہیں	ان کی آنکھیں	جھکنے والی ہیں	وہ لوگ کہتے ہیں

ءَاِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ	فِي الْحَافِرَةِ ؕ﴿۱۰﴾	ءَاِذَا كُنَّا	عِظَامًا نَّخِرَةً ؕ﴿۱۱﴾
کیا بے شک ہم ضرور لوٹائے جانے والے ہیں	اُسی قدم میں (اُلٹے پاؤں)	کیا جب ہم ہو گئے	بُھر بُھری ہڈیاں

قَالُوْا	تِلْكَ اِذًا	كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ ۘ﴿۱۲﴾	فَاِنَّمَا هِيَ
انہوں نے کہا	وہ تو پھر	خسارہ دینے والی باری ہوگی	پھر وہ تو بس

زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ ۙ﴿۱۳﴾	فَاِذَا هُمْ	بِالسَّاهِرَةِ ؕ﴿۱۴﴾
ایک (ہی) جھڑکی ہوگی	پھر جب ہی وہ لوگ	اُس میدان میں ہوں گے

نوٹ: 1

یہاں پانچ اوصاف رکھنے والی ہستیوں کی قسم جس بات پر کھائی گئی ہے اس کی وضاحت نہیں کی گئی لیکن آگے کا مضمون اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قسم اس بات پر کھائی گئی ہے کہ قیامت ضرور آئے گی اور تمام مرے ہوئے انسان دوبارہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔ اس کی وضاحت بھی نہیں کی گئی کہ یہ پانچ اوصاف کن ہستیوں کے ہیں۔ لیکن صحابہ اکرامؓ اور تابعین کی بڑی تعداد کا کہنا ہے کہ اس سے مراد فرشتے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ وقوعِ قیامت اور حیات بعد الموت پر فرشتوں کی قسم کیوں کھائی گئی، جبکہ یہ خود بھی اسی طرح غیر محسوس ہیں جس طرح وہ چیز غیر محسوس ہے جس کے واقع ہونے پر ان کو بطور گواہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل عرب فرشتوں کے وجود کے منکر نہ تھے۔ وہ تسلیم کرتے تھے کہ انسان کی جان فرشتے ہی نکالتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ بھی تھا کہ فرشتوں کی حرکت انتہائی تیز ہے۔ اور ہر حکم بلا تاخیر بجالاتے ہیں۔ وہ یہ بھی مانتے تھے کہ فرشتے کائنات کا انتظام اللہ تعالیٰ ہی کے حکم سے چلاتے ہیں، اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔ اس لیے یہاں پر استدلال اس بنا پر کیا گیا ہے کہ جب خدا کے حکم سے فرشتے تمہاری جان نکالتے ہیں تو اسی کے حکم سے وہ دوبارہ جان ڈال بھی سکتے ہیں

جب خدا کے حکم سے وہ کائنات کا انتظام چلا رہے ہیں تو اسی حکم سے وہ اس کائنات کو درہم برہم کر کے ایک دوسری دنیا بھی بنا سکتے ہیں۔(تفہیم القرآن)

1973

نوٹ:2 اس جگہ فرشتوں کی پانچ صفات بیان کی گئی ہیں جن کا تعلق انسان کی موت اور روح قبض کرنے سے ہیں مقصد تو قیامت کا حق ہونا بیان کرنا ہے لیکن شروع انسان کی موت اس کے لیے ایک جزوی قیامت ہے۔پہلی صفت اَلنّٰزِعٰتِ غَرْقًا ہے، یعنی سختی سے کھینچ کر نکالنے والے۔اس سے مراد وہ عذاب کے فرشتے ہیں جو کافر کی روح نکالتے ہیں۔دوسری صفت وَالنّٰشِطٰتِ ہے۔یہ نَشَطَ سے مشتق ہے جس کے معنے بندھن کھول دینے کے ہیں۔جس چیز میں پانی یا ہوا وغیرہ بھری ہو اس کا بندھن کھول دینے سے وہ چیز آسانی کے ساتھ نکل جاتی ہے۔اس میں مومن کی روح نکلنے کے لیے تشبیہ ہے کہ جو فرشتے مومن کی روح قبض کرنے پر مقرر ہیں وہ آسانی سے اس کو قبض کرتے ہیں۔اصل وجہ یہ ہے کہ کافر کو وقت نزع ہی برزخ کا عذاب سامنے آجاتا ہے۔اس سے گھبرا کر اس کی روح بدن میں چھپنا چاہتی ہے تو فرشتے اسے کھینچ کر نکالتے ہیں۔جبکہ مومن کی روح کے سامنے عالم برزخ کی نعمتیں آتی ہیں تو اس کی روح ان کی طرف جانا چاہتی ہے۔(معارف القرآن)

آیت نمبر (15 تا 26)

ترجمہ

هَلْ اَتٰىكَ	حَدِيْثُ مُوْسٰى ⑮	اِذْ نَادٰىهُ رَبُّهٗ
کیا پہنچی آپؐ کے پاس	موسیٰؑ کی بات	جب آواز دی انؑ کو ان کے رب نے

بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ	طُوًى ج ⑯	اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ	اِنَّهٗ طَغٰى ز ⑰
پاک کی ہوئی وادی میں	جو طویٰ (کہلاتی) ہے	(اور کہا کہ) آپؐ جائیں گے فرعون کی طرف	بیشک اس نے سرکشی کی

فَقُلْ	هَلْ لَّكَ اِلٰٓى	اَنْ تَزَكّٰى لا ⑱	وَاَهْدِيَكَ
پھر آپؐ کہیں	کیا تیرے لیے اس کی طرف (کوئی رجحان ہے)	کہ تو تزکیہ حاصل کرے	اور (اس طرف) کہ میں تیری رہنمائی کروں

اِلٰى رَبِّكَ	فَتَخْشٰى ج ⑲	فَاَرٰىهُ	الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى ز ⑳
تیرے رب کی طرف	نتیجتاً تو رعب محسوس کرے (اس کا)	تو انہوںؑ نے دکھائی اس (فرعون) کو	وہ سب سے بڑی نشانی

فَكَذَّبَ وَعَصٰى ز ㉑	ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى ز ㉒	فَحَشَرَ فَنَادٰى ز ㉓
پس اس نے جھٹلایا اور نافرمانی کی	پھر اس نے پیٹھ پھیری بھاگ دوڑ کرتے ہوئے	پھر اس نے اکٹھا کیا (سب کو) تو آواز دی

فَقَالَ	اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ز ㉔	فَاَخَذَهُ اللّٰهُ
پھر اس نے کہا	میں تم لوگوں کا سب سے برتر پرورش کرنے والا ہوں	تو پکڑا اس کو اللہ نے

نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى ط ㉕	اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ	لَعِبْرَةً	لِّمَنْ يَّخْشٰى ع ㉖
دنیا اور آخرت کے عبرتناک سزا میں	بیشک اس میں	یقیناً ایک عبرت ہے	اس کے لیے جو ڈرتا ہے (رب سے)

نوٹ:1 سابقہ آیات میں عذاب قیامت کی تصویر تھی۔اب یہ اس عذاب کی تاریخی شہادت کا حوالہ ہے جس سے رسولوں کو جھٹلانے والوں کو اس دنیا میں 6973 سابقہ پیش آیا ہے۔اس کے لیے حضرت موسیٰؑ اور فرعون کی سرگزشت کا انتخاب فرمایا ہے جو سب سے زیادہ مشہور معروف شہادت ہے۔ (تدبر قرآن)

نوٹ:2 حضرت موسیٰؑ کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ تم اور ہارون، دونوں بھائی اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا، شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈرے۔(طٰہٰ۔44)۔اس نرم کلام کا ایک نمونہ تو یہاں آیت۔18۔19۔میں دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مبلغ کو کسی بگڑے ہوئے آدمی کی ہدایت کے لیے کس حکمت کے ساتھ تبلیغ کرنی چاہیے۔دوسرے نمونے سورۂ طٰہٰ۔آیت 49 تا 52، الشعراء۔23 تا 28 اور القصص۔37۔میں دیئے گئے ہیں۔یہ منجملہ ان آیات کے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں حکمت تبلیغ کی تعلیم دی ہے۔(تفہیم القرآن)

نوٹ:3 ان آیات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ صرف بنی اسرائیل کی رہائی کے لیے ہی فرعون کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے، جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، بلکہ ان کی بعثت کا پہلا مقصد فرعون اور اس کی قوم کو راہ راست دکھانا تھا اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ اگر وہ راہ راست قبول نہ کرے تو بنی اسرائیل کو (جو اس وقت کی مسلمان قوم تھے) اس کی غلامی سے چھڑا کر مصر سے نکال لائیں۔یہ بات ان آیات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کیوں کہ ان میں سرے سے بنی اسرائیل کی رہائی کا ذکر ہی نہیں ہے۔بلکہ موسیٰؑ کو فرعون کے سامنے صرف حق کی تبلیغ پیش کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔اور ان مقامات سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے جہاں موسیٰؑ نے اسلام کی تبلیغ بھی کی ہے اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ بھی فرمایا ہے۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ:4 فرعون کا رب اعلیٰ ہونے کا دعویٰ قرآن مجید میں کئی مقامات پر بیان کیا گیا ہے، مثلاً الشعراء۔29۔القصص۔38۔لیکن ان باتوں سے فرعون کا یہ مطلب نہ تھا، اور نہ ہی ہوسکتا تھا، کہ وہی کائنات کا خالق ہے۔یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا منکر اور خود رب العالمین ہونے کا مدعی تھا۔یہ مطلب بھی نہ تھا کہ وہ صرف اپنے آپ ہی کو مذہبی معنوں میں لوگوں کا معبود قرار دیتا تھا۔قرآن مجید ہی میں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، وہ خود دوسرے معبودوں کی پرستش کرتا تھا۔چنانچہ اس کے اہل دربار نے ایک موقع پر اس کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ کیا آپ موسیٰ اور اس کی قوم کو یہ آزادی دیتے چلے جائیں گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں۔الاعراف۔127۔پس درحقیقت وہ مذہبی معنی میں نہیں بلکہ سیاسی معنی میں اپنے آپ کو الٰہ اور رب اعلیٰ کہتا تھا۔اس کا مطلب یہ تھا کہ اقتدار اعلیٰ کا مالک میں ہوں، میرے سوا کسی کو میری مملکت میں حکم چلانے کا حق نہیں ہے اور میرے اوپر کوئی بالاتر طاقت نہیں ہے جس کا فرمان یہاں جاری ہوسکتا ہو۔(تفہیم القرآن)

آیت نمبر (27 تا 46)

س م ك

(ن) سَمْكًا بلند کرنا۔اونچا اٹھانا۔

سَمْكٌ اسم ذات ہے۔چھت۔ہر اونچی چیز کا قد وقامت۔ابھار۔زیر مطالعہ آیت۔28۔

غ ط ش

6973

(س) غَطَشًا کمزور نظر والا ہونا۔

(افعال) اِغْطَاشًا تاریک کرنا۔ زیر مطالعہ آیت۔29۔

ذ ک ر

(ف) دَحْيًا کسی چیز کو پھیلانا۔ زیر مطالعہ آیت۔30۔

د ح ی

(ف) طَمًّا کسی کا کسی چیز کو ڈھانک لینا۔ کسی پر چھا جانا۔

طَامَّةٌ اسم الفاعل ہے۔ چھا جانے والی۔ آفت، زیر مطالعہ آیت۔34۔

ترکیب

(آیت۔27) بَنٰهَا میں فعل بَنٰی کی ضمیر مفعولی هَا۔ اَلسَّمَآءُ کے لیے ہے۔ (آیت۔28۔29) سَمْكَهَا۔ سَوّٰهَا۔ لَيْلَهَا۔ ضُحٰهَا۔ ان سب میں بھی هَا کی ضمیریں اَلسَّمَآءُ کے لیے ہیں۔ (آیت۔30) وَالْاَرْضَ کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ فعل بَنٰی کا مفعول ہے۔ بَعْدَ ذٰلِكَ میں ذٰلِكَ کا اشارہ اَلسَّمَآءُ کی طرف مانا جا سکتا ہے اور اَلْاَرْضَ کی طرف بھی۔ اگر اَلسَّمَآءُ کی طرف مانا جائے تو مطلب ہوگا آسمان بنانے کے بعد زمین بنائی۔ اور اگر اَلْاَرْضَ کی طرف مانا جائے تو مطلب ہوگا زمین بنانے کے بعد اس کو پھیلایا۔

(آیت۔31۔32) دَحٰهَا۔ مِنْهَا۔ مَآءَهَا۔ مَرْعٰهَا۔ اَرْسٰهَا۔ ان سب میں هَا کی ضمیریں اَلْاَرْضَ کے لیے ہیں۔ فعل اَرْسٰی دو مفعولوں کا تقاضہ کرتا ہے کس کو جمایا۔ کس میں جمایا۔ یہاں اَلْجِبَالَ فعل اَرْسٰی کا مفعول مقدم اول ہے اور اس کے ساتھ هَا کی ضمیر مفعولی مفعول ثانی ہے۔

(آیت۔34۔35۔) فَاِذَا جَآءَتِ میں اِذَا شرطیہ ہے، اس کا جواب شرط محذوف ہے، کہ جب اَلطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى آئے گی تو سابقہ آیات میں آسمان و زمین کی بناوٹ، سب درہم برہم ہو جائے گی۔ يَوْمَ اسی محذوف جواب شرط کا ظرف ہے۔

(آیت۔39)۔ فَاِنَّ کا اسم اَلْجَحِيْمَ ہے اور اَلْمَاْوٰى اس کی خبر معرفہ ہے اس لیے هِيَ ضمیر فاصل آئی ہے جس سے حصر کا مفہوم پیدا ہوا ہے۔ (آیت۔43) فِيْمَ اصل میں فِيْ مَا ہے اور یہ مَا استفہامیہ ہے۔

ترجمہ

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ	خَلْقًا	اَمِ السَّمَآءُ ؕ	بَنٰهَا ﴿۲۷﴾
کیا تم لوگ زیادہ شدید ہو	بلحاظ تخلیق کرنے کے	یا یہ آسمان	اسی نے بنایا جس کو

رَفَعَ سَمْكَهَا	فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾	وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا
اور اس نے بلند کیا اس کی اُٹھان کو	پھر اس نے ہموار کیا اس کو	اور اس نے تاریک کیا اس کی رات کو

وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا ﴿۲۹﴾	وَالْاَرْضَ	بَعْدَ ذٰلِكَ	دَحٰهَا ﴿۳۰﴾
اور اس نے نکالا اس کی روشنی کو	اور (اس نے بنایا) زمین کو	اس کے بعد	اس نے پھیلایا اس کو

اَخۡرَجَ مِنۡهَا مَآءَهَا	وَمَرۡعٰىهَا ۖ﴿۳۱﴾	وَالۡجِبَالَ اَرۡسٰىهَا ۙ﴿۳۲﴾	مَتَاعًا 6973
اس نے نکالا اس سے اس کا پانی	اور اس کا چارا	اور پہاڑوں کو اس نے جمایا اس میں	برتنے کا سامان ہوتے ہوئے

لَّكُمۡ وَلِاَنۡعَامِكُمۡ ؕ﴿۳۳﴾	فَاِذَا جَآءَتِ	الطَّآمَّةُ الۡكُبۡرٰى ۖ﴿۳۴﴾
تمہارے لیے اور تمہارے مویشیوں کے لیے	پھر جب آئے گی	وہ سب سے بڑی چھا جانے والی (قیامت تو یہ سب درہم برہم ہو جائے گا)

يَوۡمَ يَتَذَكَّرُ الۡاِنۡسَانُ	مَا سَعٰى ۙ﴿۳۵﴾	وَبُرِّزَتِ الۡجَحِيۡمُ
اس دن یاد کرے گا انسان	اس کو جو اس نے دوڑ دھوپ کی	اور ظاہر کی جائے گی دوزخ

لِمَنۡ يَّرٰى ﴿۳۶﴾	فَاَمَّا مَنۡ طَغٰى ۙ﴿۳۷﴾	وَاٰثَرَ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ۙ﴿۳۸﴾
اس کے لیے جو دیکھے گا (یعنی دوزخی کے لیے)	تو وہ جو ہے جس نے سرکشی کی	اور اس نے ترجیح دی دنیوی زندگی کو

فَاِنَّ الۡجَحِيۡمَ	هِىَ الۡمَاۡوٰى ؕ﴿۳۹﴾	وَاَمَّا مَنۡ خَافَ	مَقَامَ رَبِّهٖ
تو (اس کے لیے) یقیناً دوزخ	ہی ٹھکانہ ہے	اور وہ جو ہے جس نے خوف کیا	اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کے وقت کا

وَنَهَى النَّفۡسَ	عَنِ الۡهَوٰى ۙ﴿۴۰﴾	فَاِنَّ الۡجَنَّةَ	هِىَ الۡمَاۡوٰى ؕ﴿۴۱﴾
اور اس نے روکا (اپنے) جی کو	(من کی) چاہت سے	تو (اس کے لیے) یقیناً جنت	ہی ٹھکانہ ہے

يَسۡـَٔلُوۡنَكَ	عَنِ السَّاعَةِ	اَيَّانَ مُرۡسٰىهَا ؕ﴿۴۲﴾	فِيۡمَ اَنۡتَ
یہ لوگ پوچھتے ہیں آپؐ سے	اُس گھڑی (قیامت) کے بارے میں	کب ہے اس کے قائم ہونے کا وقت	اس میں کیا ہے آپ کو

مِنۡ ذِكۡرٰىهَا ؕ﴿۴۳﴾	اِلٰى رَبِّكَ	مُنۡتَهٰىهَا ؕ﴿۴۴﴾	اِنَّمَاۤ اَنۡتَ
اس کے ذکر میں سے	آپؐ کے رب کی طرف ہیں	اس کے ٹھہرنے کا وقت ہے	آپ تو بس

مُنۡذِرُ مَنۡ	يَّخۡشٰىهَا ؕ﴿۴۵﴾	كَاَنَّهُمۡ
اس کو خبردار کرنے والے ہیں جو	ڈرتا ہے اس سے	(ایسا لگے گا) جیسے کہ وہ لوگ

يَوۡمَ يَرَوۡنَهَا	لَمۡ يَلۡبَثُوۡۤا	اِلَّا عَشِيَّةً اَوۡ ضُحٰىهَا ؕ﴿۴۶﴾
جس دن وہ دیکھیں گے اس کو،	ٹھہرے ہی نہیں	سوائے ایک شام کے یا اس کی صبح کے

نوٹ: 1

سورۃ البقرہ کی آیت۔29۔اور حٰمٓ السجدہ کی آیات۔9 تا 12۔ سے معلوم ہوتا ہے کہ سات آسمان زمین کی پیدائش کے بعد بنائے گئے۔ اور النّٰزِعٰت کی آیت۔30۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین آسمان کے بعد بچھائی گئی۔ اس کے جواب کئی طرح دیئے گئے ہیں۔ احقر کو ابوحیان کی تقریر پسند ہے یعنی ضروری نہیں کہ سابقہ آیات میں ثُمَّ اور زیر مطالعہ آیت میں بَعۡدَ ذٰلِكَ تراخیٔ زمان (زمانے کے رخ یعنی ترتیب) کے لیے ہو۔ ممکن ہے ان الفاظ سے تراخی فی الاخبار (خبروں کی ترتیب) یا تراخیٔ رُتبی (رتبے کی ترتیب) مراد لیں جیسے قرآن کی دوسری جگہوں میں یہ ہی معنی مراد لیے گئے ہیں۔ بہرحال قرآن کریم میں ترتیب زمانی کی ترتیب نہیں ہے۔ ہاں نعمت کے تذکرہ میں زمین کا اور

عظمت وقدرت کے تذکرہ میں آسمان کا ذکر مقدم رکھا ہے۔(ترجمہ شیخ الہندؒ۔تفسیر آیات حٰم السجدہ)

امام راغب اصفہانیؒ نے وحٰی (مادہ ''دح ی'') کے معنے کسی چیز کو اس کے مقر (جائے قرار) سے ہٹا دینے کے لکھے ہیں۔تو شاید اس لفظ میں ادھر اشارہ ہو جو آج کل کی تخلیق ہے کہ زمین اصل میں کسی بڑے جرم فلکی کا ایک حصہ ہے جو اس سے الگ ہو گیا۔واللہ اعلم۔(ترجمہ شیخ الہندؒ۔تفسیر آیت۔النّٰزعٰت)

اس کے بعد زمین کو بچھانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آسمان کے بعد زمین کو پیدا کیا۔بلکہ یہ ایسا ہی طرز بیان ہے جس میں مقصود ایک بات کے بعد دوسری بات کی طرف توجہ دلانا ہوتا ہے، اگرچہ دونوں ایک ساتھ پائی جاتی ہوں۔اس طرزِ بیان کی متعدد مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں۔مثلاً سورۃ القلم۔آیت۔13 میں فرمایا عُتُلٍّ بَعْدَ ذٰلِکَ زَنِیْمٍ (جفا کار ہے اس کے بعد بداصل ہے)۔اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ جفا کار بنا اس کے بعد بداصل بنا۔بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص جفا کار ہے اور اس پر مزید یہ کہ بداصل بھی ہے۔(تفہیم القرآن)۔قرآن میں ترتیب زمانی کے ضمن میں آیت۔2۔40،نوٹ۔1(۳) کو بھی دوبارہ دیکھ لیں تو بات مزید واضح ہو جائے گی (مرتب)

نوٹ:2

ان آیات میں (یعنی آیت۔27 تا33 میں) قیامت اور حیات بعد الموت کے لیے دو حیثیتوں سے استدلال کیا گیا ہے۔ایک یہ کہ اس خدا کی قدرت سے حیات بعد الموت کا برپا کرنا ہرگز بعید نہیں ہے جس نے یہ وسیع اور عظیم کائنات اس حیرت انگیز توازن کے ساتھ اور یہ زمین اس سروسامان کے ساتھ بنائی ہے۔دوسرے یہ کہ اللہ کے کمال حکمت کے جو آثار اس کائنات اور اس زمین میں صریحاً نظر آ رہے ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ یہاں کوئی کام بے مقصد نہیں ہو رہا ہے بلکہ کوئی بہت سوچا سمجھا منصوبہ اس کے پیچھے کارفرما ہے۔یہ رات اور دن کا باقاعدگی سے آنا اس بات پر گواہ ہے کہ زمین کو آباد کرنے کے لیے یہ نظم کمال درجہ دانائی سے قائم کیا گیا ہے۔خود اسی زمین میں وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں 24 گھنٹے کے اندر رات اور دن کا الٹ پھیر ہو جاتا ہے۔اور وہ خطے بھی موجود ہیں جہاں بہت لمبے دن اور بہت لمبی راتیں ہوتی ہیں۔زمین کی آبادی کا بہت بڑا حصہ پہلی قسم کے خطوں میں اور جہاں رات اور دن جتنے زیادہ لمبے ہوتے جاتے ہیں، وہاں زندگی زیادہ سے زیادہ دشوار اور آبادی کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔یہاں تک کہ چھ مہینے کے دن اور چھ مہینے کی راتیں رکھنے والے علاقے آبادی کے بالکل قابل نہیں ہیں۔یہ دونوں نمونے اسی زمین پر دکھا کر اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کی شہادت پیش کر دی ہے کہ رات اور دن کی آمد و رفت کا یہ باقاعدہ انتظام کچھ اتفاقاً نہیں ہو گیا ہے، بلکہ یہ زمین کو آبادی کے قابل بنانے کے لیے بڑی حکمت کے ساتھ ٹھیک ایک اندازے کے مطابق کیا گیا ہے۔

اسی طرح زمین کو اس طرح بچھانا کہ وہ سکونت کے قابل بن سکے۔اس میں وہ پانی پیدا کرنا جو انسان اور حیوان کے لیے پینے کے قابل اور نباتات کے لیے روئیدگی کے قابل ہو۔یہ سارے کام اس بات کی صریح علامت ہیں کہ یہ بے مقصد کام نہیں ہیں۔اب یہ ہر صاحب عقل کے سوچنے کی بات ہے کہ آخرت کا ہونا حکمت کا تقاضا ہے یا نہ ہونا؟ کیوں کہ اس سے بڑی کوئی بے مقصد بات نہیں ہو سکتی کہ اس زمین میں انسان کو تصرف کے وسیع اختیارات دے کر اسے چھوڑ دیا جائے اور کبھی اس کا محاسبہ نہ کیا جائے۔

نوٹ:3

آیات۔37 تا41۔میں اہل دوزخ اور اہل جنت کی خاص خاص علامات کا بیان ہے جس سے ایک انسان دنیا ہی میں یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اس ضابطہ کے مطابق میرا ٹھکانہ دوزخ میں ہے یا جنت میں۔ضابطہ اس لیے کہا گیا ہے کہ کسی کی شفاعت سے یا بلا واسطہ اللہ کی رحمت سے کسی جہنمی کو وہاں سے نکال کے جنت میں پہنچا دینا ایک استثنائی حکم ہے اور جنت یا دوزخ میں ٹھکانے کا اصل ضابطہ وہی ہے جو ان آیات میں بیان فرمایا ہے۔

پہلے اہل جہنم کی خاص علامات بیان کی گئیں، وہ دو ہیں۔ اول طغیان یعنی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی پابندی کرنے کی بجائے سرکشی کرنا۔ دوم دنیا کی زندگی کو آخرت پر ترجیح دینا۔ یعنی جب ایسا کوئی کام سامنے آئے کہ اس کے اختیار کرنے سے دنیا میں تو آرام یا لذت ملتی ہے مگر آخرت میں اس پر عذاب مقرر ہے، اس وقت وہ دنیا کی لذت کو ترجیح دے کر آخرت کی فکر کو نظر انداز کر دے۔ جو شخص دنیا میں ان دو بلاؤں میں مبتلا ہے اس کے لیے فرمادیا کہ جہنم ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔ اس کے بعد اہل جنت کی اسی طرح دو علامتیں بتائی ہیں۔ اول یہ کہ جس شخص کو دنیا میں اپنے ہر عمل ہر کام کے وقت یہ خوف لگا رہے کہ مجھے ایک روز اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر ان اعمال کا حساب دینا ہوگا۔ دوم یہ کہ جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا اور ناجائز خواہشوں سے اس کو روک دیا۔ جس نے دنیا میں یہ دو وصف حاصل کر لیے قرآن کریم نے اس کو یہ خوشخبری دی ہے کہ جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہے۔

6973

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ عبس (80)

آیت نمبر (1 تا 23)

ترکیب

(آیات۔13 تا 16) فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ سے پہلے فعل کُتِبَ محذوف ہے۔ اس کا نائب فاعل اس میں شامل ھُوَ کی ضمیر ہے جو تَذۡکِرَۃٌ کے لیے ہے۔ واضح رہے کہ تَذۡکِرَۃٌ مصدر ہے جو مذکر مؤنث دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے اس سے پہلے اِنَّھَا میں اس کے لیے ھَا کی مونث ضمیر آئی ہے اور اگلی آیت میں ذَکَرَہٗ میں اسی کے لیے ہٗ کی مذکر ضمیر آئی ہے۔ صُحُفٍ جمع مکسر ہے، اس لیے اس کی صفت مُکَرَّمَۃٍ واحد مونث آئی ہے۔ آگے مَرۡفُوۡعَۃٍ اور مُطَہَّرَۃٍ بھی صُحُفٍ کی خصوصیات ہیں۔ سَفَرَۃٍ نکرہ مخصوصہ ہے۔ جبکہ کِرَامٍ اور بَرَرَۃٍ اس کی خصوصیات ہیں۔ (آیت۔23)۔ اس آیت کو گزشتہ آیت سے بھی متعلق مانا جا سکتا ہے اور اگلی آیت سے بھی اگر اس کو گزشتہ آیت سے متعلق مانا جائے تو یَقۡضِ میں شامل ھُوَ کی ضمیر فاعلی کو شَاءَ کے فاعل یعنی اللہ تعالیٰ کے لیے مانا جائے گا اور اَمَرَہٗ میں ہٗ کی ضمیر کو مَا کی ضمیر عائد مانا جائے گا۔ ابن کثیرؒ نے اسی رائے کو اختیار کیا ہے۔ (منقول از ترجمہ شیخ الہندؒ) اگر اس کو اگلی آیت سے متعلق مانا جائے تو پھر یَقۡضِ کی ضمیر فاعلی آیت۔17۔ میں اَلۡاِنۡسَانُ کے لیے مانی جائے گی اور اَمَرَہٗ کی ضمیر مفعولی بھی اُسی اَلۡاِنۡسَانُ کے لیے ہوگی۔

ترجمہ

عَبَسَ وَتَوَلّٰۤی ۙ﴿۱﴾	اَنۡ جَآءَہُ الۡاَعۡمٰی ؕ﴿۲﴾	وَمَا یُدۡرِیۡکَ
انہوں ؐ نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا	(اس لیے) کہ آئے ان ؐ کے پاس وہ نابینا ؓ	اور آپ ﷺ کو کیا خبر

لَعَلَّہٗ یَزَّکّٰۤی ۙ﴿۳﴾	اَوۡ یَذَّکَّرُ	فَتَنۡفَعَہُ	الذِّکۡرٰی ؕ﴿۴﴾
شاید کہ وہ ؓ پاکیزگی حاصل کرتے	یا وہ یاددہانی حاصل کرتے	نتیجتاً نفع دیتی ان کو	وہ عظیم نصیحت (یعنی قرآن)

اَمَّا مَنِ اسۡتَغۡنٰی ۙ﴿۵﴾	فَاَنۡتَ لَهٗ	تَصَدّٰی ؕ﴿۶﴾	وَمَا عَلَیۡكَ 6973
وہ جو ہے جس نے بے پرواہی اختیار کی	تو آپؐ اس کے لیے ہی	متوجہ ہوئے	اور آپؐ پر نہیں ہے (کوئی الزام)

اَلَّا یَزَّکّٰی ؕ﴿۷﴾	وَ اَمَّا مَنۡ	جَآءَكَ یَسۡعٰی ۙ﴿۸﴾	وَهُوَ یَخۡشٰی ۙ﴿۹﴾
کہ وہ پاکیزگی حاصل نہیں کرتا	اور وہ جو ہے جو	آیا آپؐ کے پاس بھاگتا دوڑتا	اس حال میں کہ وہ ڈرتا ہے

فَاَنۡتَ عَنۡهُ تَلَهّٰی ۚ﴿۱۰﴾	كَلَّاۤ اِنَّهَا	تَذۡكِرَةٌ ۚ﴿۱۱﴾	فَمَنۡ شَآءَ
تو آپؐ نے اس سے غفلت برتی	ہرگز نہیں! بیشک یہ (قرآن)	ایک یاددہانی ہے	پس جو چاہے

ذَكَرَهٗ ؕ﴿۱۲﴾	فِیۡ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۙ﴿۱۳﴾	مَّرۡفُوۡعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۙ﴿۱۴﴾
وہ یاد رکھے اس کو	(اس کو لکھا گیا) معزز کیے ہوئے ایسے صحیفوں میں جو	بلندی دیئے ہوئے پاکیزگی دیئے ہوئے ہیں

بِاَیۡدِیۡ سَفَرَةٍ ۙ﴿۱۵﴾	كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ ؕ﴿۱۶﴾	قُتِلَ الۡاِنۡسَانُ	مَاۤ اَكۡفَرَهٗ ؕ﴿۱۷﴾
کچھ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں سے جو	بزرگی والے نیکی کرنے والے ہیں	مارا جائے انسان	کس قدر ناشکرا ہے وہ

مِنۡ اَیِّ شَیۡءٍ	خَلَقَهٗ ؕ﴿۱۸﴾	مِنۡ نُّطۡفَةٍ ؕ	خَلَقَهٗ	فَقَدَّرَهٗ ۙ﴿۱۹﴾
(سوچو تو) کس چیز سے	اس نے پیدا کیا اس کو	(پانی کی) ایک بوند سے	اس نے تخلیق کی اس کی	پھر اس نے تقدیر مقرر کی اس کی

ثُمَّ السَّبِیۡلَ	یَسَّرَهٗ ۙ﴿۲۰﴾	ثُمَّ اَمَاتَهٗ	فَاَقۡبَرَهٗ ۙ﴿۲۱﴾	ثُمَّ اِذَا شَآءَ
پھر راہ کو	اس نے آسان کیا اس کے لیے	پھر اس نے موت دی اس کو	تو اس نے دفن کرایا اس کو	پھر جب وہ چاہے گا

اَنۡشَرَهٗ ؕ﴿۲۲﴾	كَلَّا	لَمَّا یَقۡضِ	مَاۤ	اَمَرَهٗ ؕ﴿۲۳﴾
تو وہ دوبارہ زندہ کرے گا اس کو	ہرگز نہیں	ابھی تک اس نے پورا نہیں کیا	اس کو	جس کا اس نے حکم دیا اُسے

نوٹ: 1

عَبَسَ کا فاعل یہاں مذکور نہیں ہے لیکن آگے کی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ فاعل نبی ﷺ ہیں۔ اَعۡمٰی سے اشارہ یہاں عبداللہ بن ام مکتومؓ کی طرف ہے۔ یہ ایک نابینا صحابی تھے۔ ایک دن نبی ﷺ قریش کے لیڈروں سے باتیں کر رہے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کے سامنے اسلام پیش کیا تھا۔ اسی اثنا میں عبداللہ بن ام مکتومؓ تشریف لائے اور موقع کی نزاکت کا اندازہ نہ کر سکنے کے باعث وہ بھی مجلس میں پہنچ گئے۔ ان کا یہ بے موقع آجانا حضور ﷺ کو ناگوار گزرا۔ اسی واقعہ کو جو اتفاق سے پیش آ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو یہ تعلیم دینے کا ذریعہ بنا لیا کہ آپ ﷺ اپنی توجہ کا اصل مرکز ان صحابہؓ کو بنائیں جو اپنی اصلاح اور تربیت کی طلب میں آپ ﷺ کی مجلس میں آتے ہیں اور ان لوگوں کے درپے زیادہ نہ ہوں جو بے نیاز ہیں۔ (تدبر قرآن)

اس موقع میں یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو کام بیک وقت آ گئے تھے۔ ایک مسلمان کی تعلیم اور اس کی دلجوئی اور دوسرے غیر مسلموں کی ہدایت کے لیے ان کی طرف توجہ۔ قرآن کریم کے اس ارشاد نے یہ واضح کر دیا کہ پہلا کام دوسرے کام پر مقدم ہے۔ دوسرے کام کی وجہ سے پہلے کام میں تاخیر کرنا یا خلل ڈالنا درست نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح کی فکر، غیر مسلموں کو اسلام میں داخل کرنے کی فکر سے اہم اور مقدم ہے۔ اس میں ایسے علماء کے لیے ایک اہم ہدایت ہے جو غیر مسلموں کو اسلام سے

مانوس کرنے کی خاطر بعض ایسے کام کر بیٹھتے ہیں جن سے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات یا شکایات پیدا ہو جاتی ہیں۔ان کو اس قرآنی ہدایت کے مطابق مسلمانوں کی اصلاح کو مقدم رکھنا چاہیے۔(معارف القرآن)

نوٹ:2 آیت۔15۔میں سَفَرَۃٍ کا لفظ سَافِرٌ کی جمع بھی ہو سکتا ہے جس کے معنی کاتب کے ہیں۔اس صورت میں اس سے مراد فرشتے، انبیاءؑ اور ان کی وحی لکھنے والے حضرات ہوں گے۔اور یہ لفظ سَفِیْرٌ بمعنی قاصد کی جمع بھی ہو سکتا ہے۔اس صورت میں رسل ملائکہ، انبیاءؑ اور وحی کی کتابت کرنے والے صحابہؓ کے ساتھ علماء اُمت بھی اس میں داخل ہوں گے، کیونکہ وہ بھی رسول اللہ ﷺ اور امت کے درمیان سفیر اور قاصد ہیں۔(معارف القرآن)

نوٹ:3 آیت۔19۔میں فَقَدَّرَہٗ کا مطلب یہ ہے کہ انسان ابھی ماں کے پیٹ میں بن رہا ہوتا ہے تو اس کے تقدیر طے کر دی جاتی ہے۔اس کی جنس کیا ہو گی۔اس کا رنگ، قد، جسامت وغیرہ کیسی ہو گی۔اس کی شکل وصورت اور آواز کیسی ہو گی۔اس کے جسم کی طاقت اور ذہنی صلاحیتیں کیا ہوں گی۔کس سرزمین، کس خاندان اور کس ماحول میں یہ پیدا ہو گا، پرورش اور تربیت پائے گا۔اور کتنا وقت اسے زمین میں کام کرنے کے لیے دیا جائے گا۔اس تقدیر سے یہ بال برابر بھی ہٹ نہیں سکتا اور نہ اس میں ذرہ برابر ردوبدل کر سکتا ہے۔(تفہیم القرآن)

تقدیر کی مذکورہ وضاحت کے حوالے سے یہ بات ذہن نشین کر لیں کہ تقدیر کے اٹل ہونے کا تصور اس پہلو سے درست ہے کہ اس میں کوئی تبدیلی انسان کے دائرہ اختیار کے باہر ہے۔لیکن یہ تصور درست نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تقدیر میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا (اعوذ باللہ من ذالك) یا نہیں کرتا۔وہ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے، فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے۔عام قاعدہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کی جو تقدیر مقرر کر دی ہے، اس میں وہ تبدیلی نہیں کرتا۔لیکن جب چاہتا ہے، جس کے لیے چاہتا ہے اور جتنی چاہتا ہے تبدیلی کرتا ہے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تقدیر کو کوئی چیز نہیں بدل سکتی سوائے دعا کے اسی حوالے سے وہ احادیث بھی سمجھی جا سکتی ہیں جن میں عمر کے کم ہو جانے یا زیادہ ہو جانے کا ذکر ہے۔(مرتب)

نوٹ:4 آیت۔20۔میں راستہ کو آسان کر دینے کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں وہ تمام اسباب اور وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے۔ورنہ اس کے جسم اور ذہن کی ساری قوتیں بےکار ثابت ہوتیں اگر خالق نے ان کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیئے ہوتے۔مزید برآں خالق نے اس کو یہ موقع بھی دیا کہ اپنے لیے خیر یا شر، شکر یا کفر، طاعت یا نافرمانی کی جو راہ بھی اختیار کرنا چاہے کر سکے۔اس نے دونوں راستے اس کے سامنے کھول کر رکھ دیئے اور ہر راہ اس کے لیے ہموار کر دی کہ جس پر بھی چلنا چاہے چلے۔(تفہیم القرآن)

خیر کی راہوں میں انسان کی طبعیت کو پسند نہ آنے والی چیزیں اور شر کی راہوں میں من بھاتی چیزیں تو اظہر من الشّمس ہیں۔اور ہر انسان ان راہوں کی اس ظاہری حقیقت کو خوب جانتا ہے۔لیکن ان راہوں کا انجام اتنا ظاہر نہیں ہے اور ظاہر بین نگاہوں کی پہنچ سے باہر ہے۔دونوں راہوں کے باطنی حقائق اور ان کے انجام کو ظاہر کرنے اور انسان کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء ورسل اور کتب کا سلسلہ قائم کیا جو نبی ﷺ کی بعثت اور نزولِ قرآن سے اپنے تکمیلی مرحلہ تک پہنچ گیا۔اب انسان کی اُخروی کامیابی کا راز اس میں ہے کہ وہ اپنی طبعیت اور اپنے موڈ کو لگام دے کر، انجام پر نظر رکھتے ہوئے زندگی کے سفر میں پیش آنے والی متبادل راہوں کا انتخاب کرتے ہوئے اپنا سفر مکمل کرے۔اس انتخاب میں اللہ تعالیٰ کوئی مداخلت نہیں کرتا اور اس نے انسان کو اس ضمن میں مکمل خودمختاری دی ہوئی ہے۔یہی وجہ ہے کہ تقدیر کی مجبوری

6973 کے باوجود انسان جوابدہ ہے اور جزا و سزا کا مستحق ہے۔ یہ نکتہ جن لوگوں کے سمجھ میں نہیں آتا، وہ پھر چیخ اٹھتے ہیں۔
ناحق ہم مجبوروں پر تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کرے ہیں، ہم کو عبث بدنام کیا
یہ درست ہے کہ انسان اپنی تقدیر کے فریم ورک کے اندر زندگی کا سفر کرنے کا پابند ہے اور اپنے فریم ورک میں بال برابر تبدیلی کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ یہ اس کی مجبوری کا دائرہ ہے۔ اور اس فریم ورک کے اندر سفر کرتے ہوئے متبادل راہوں کے انتخاب کی اسے مکمل آزادی ہے۔ یہ اس کی خودمختاری کا دائرہ ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (24 تا 42)

ق ض ب

(ض) قَضْبًا — لمبے اور پھیلے ہوئے درخت اگنا۔ کاٹنا۔
قَضْبٌ — ہر وہ درخت جس کی شاخیں لمبی ہو کر لٹک جائیں۔ سبزی ترکاری۔ زیر مطالعہ آیت۔28۔

ء ب ب

(ض) اَبًّا — کسی کام کے لیے تیار ہونا۔
اَبٌّ — ایسی گھاس جو کٹنے کے لیے تیار ہو۔ مویشی کا چارہ۔ زیر مطالعہ آیت۔31۔

ص خ خ

(ن) صَخًّا — کرخت آواز کا کان کو بہرا کر دینا۔
صَاخَّةٌ — بہرا کر دینے والی چیخ۔ زیر مطالعہ۔33۔

ترجمہ

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ	اِلٰى طَعَامِهٖٓ ﴿۲۴﴾	اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ﴿۲۵﴾
پس چاہیے کہ دیکھے انسان	اپنے کھانے کی طرف	بیشک ہم نے ہی برسایا پانی جیسے برساتے ہیں

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ﴿۲۶﴾	فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ﴿۲۷﴾	وَّعِنَبًا وَّقَضْبًا ﴿۲۸﴾
پھر ہم نے پھاڑا، زمین کو جیسے پھاڑتے ہیں	تو ہم نے اگائے اس میں دانے (اناج)	اور انگور اور ترکاری

وَّزَيْتُوْنًا وَّنَخْلًا ﴿۲۹﴾	وَّحَدَآئِقَ غُلْبًا ﴿۳۰﴾	وَّفَاكِهَةً وَّاَبًّا ﴿۳۱﴾
اور زیتون اور کھجوریں	اور باغات موٹے تنے والے درختوں کے	اور میوہ اور مویشی کا چارہ

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۲﴾	فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ ﴿۳۳﴾
برتنے کا سامان ہوتے ہوئے تمہارے لیے اور تمہارے چوپایوں کے لیے	پھر جب آئے گی وہ کان پھاڑنے والی چیخ (نفخۂ صور)

6973

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ	مِنْ اَخِيْهِ ﴿۳۴﴾	وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ﴿۳۵﴾	وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ ﴿۳۶﴾
جس دن بھاگیں گے سارے مرد	اپنے بھائی سے	اور اپنی ماں سے اور اپنے والد سے	اور اپنی ساتھ والی (بیوی) سے اور اپنے بیٹوں سے

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ	يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ	يُّغْنِيْهِ ﴿۳۷﴾	وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ﴿۳۸﴾
ہر مرد کے لیے ان میں سے	اُس دن ایک ایسی مصروفیات (فکر) ہوگی جو	کافی ہوگی اس کو	کچھ چہرے اس دن روشن ہونے والے ہیں

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ﴿۳۹﴾	وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ	عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ﴿۴۰﴾
ہنسنے والے ہیں خوشی منانے والے ہیں	اور کچھ چہرے ہوں گے اس دن	جن پر گرد و غبار ہوگا

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ﴿۴۱﴾	اُولٰٓئِكَ	هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿۴۲﴾
چھا جائے گی ان پر سیاہی	یہ لوگ	ہی ناشکری کرنے والے نافرمانی کرنے والے ہیں

نوٹ: 1

انسان اپنی غذا کے مسئلہ پر ذرا غور کی نگاہ ڈالے جس پر اس کی زندگی کا انحصار ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ اس کو پیدا کرتا ہے، پھر ضروریات کی نوعیت کے لحاظ سے کتنی گوناگوں شکلوں میں اس کو پھیلا دیتا ہے۔ اگر وہ اس پر غور کرے گا اور اس کی عقل میں فتور نہیں ہے تو نہایت آسانی سے یہ نکتہ اس کی سمجھ میں آجائے گا کہ ربوبیت کا یہ وسیع نظام تقاضہ کرتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے آگے جوابدہ ہو اور اس سے پوچھا جائے کہ ان نعمتوں کا حق ادا کیا یا نہیں۔ (تدبر قرآن)

نوٹ: 2

آیت۔26۔ کا مطلب یہ ہے کہ ایک گھاس کے تنکے کی کیا طاقت تھی کہ وہ زمین کو چیر کر باہر نکل آتا۔ یہ قدرت کا ہاتھ ہے جو زمین کو پھاڑ کر اس سے طرح طرح کے غلے، پھل، سبزے، ترکاریاں وغیرہ نکالتا ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

زمین کو پھاڑنے سے مراد اس کو اس طرح پھاڑنا ہے کہ جو بیج یا گٹھلیاں وغیرہ انسان اس کے اندر بوئے یا جو کسی اور طریقے سے زمین کے اندر پہنچ جائیں، وہ اپنی کونپلیں نکال سکیں۔ انسان اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا کہ وہ زمین میں ہل چلاتا ہے اور جو بیج خدا نے پیدا کر دیئے ہیں، انہیں وہ زمین میں اتار دیتا ہے۔ اس کے سوا سب کچھ خدا کا کام ہے۔ اسی نے بے شمار قسم کی نباتات کے بیج پیدا کیے ہیں۔ اسی نے ان بیجوں میں یہ خاصیت پیدا کی ہے کہ زمین میں پہنچ کر وہ پھوٹیں اور ہر بیج سے اس کی جنس کے نباتات اُگے۔ اور اسی نے زمین میں یہ صلاحیت پیدا کی ہے کہ پانی سے مل کر وہ ان بیجوں کو کھولے اور ہر جنس کی نباتات کے لیے اس کے مناسب حال غذا بہم پہنچا کر اسے نشوونما دے خدا نے یہ انتظام نہ کیا ہوتا تو کیا کوئی انسان کوئی بھی غذا پا سکتا تھا۔ (تفہیم القرآن)

6973

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ التکویر(81)

آیت نمبر(1تا14)

ك د ر

(ن)	کَدَرًا	گدلا ہونا، میلا ہونا۔
(انفعال)	اِنۡکِدَارًا	کسی چیز کا بکھر کر بجھ جانا۔ بے نور ہوجانا۔ زیر مطالعہ آیت۔2۔

و ح ش

(ض)	وَحۡشًا	انسیت نہ پانا۔ وحشت محسوس کرنا۔
	وَحۡشٌ	ج وُحُوۡشٌ۔ وہ جانور جو انسان سے مانوس نہ ہو۔ وحشی جانور۔ زیر مطالعہ آیت۔5۔

و ء د

(ض)	وَأۡدًا	کسی کو زندہ دفن کرنا۔
	مَوۡءُدَۃٌ	اسم المفعول کے مونث مفعولۃٌ کا وزن ہے۔ مَوۡءُوۡدَۃٌ کو مَوۡءٗدَۃٌ لکھتے ہیں۔ زندہ دفن کی ہوئی۔ زیر مطالعہ آیت۔8۔

ك ش ط

(ض)	کَشۡطًا	کسی چیز سے اس کا ڈھکنا اتارنا۔ کسی کی کھال اتارنا۔ آیت۔11۔

ترکیب

آیات۔1 تا13۔ میں تمام جملے اِذَا سے شروع ہو رہے ہیں اس لیے ان میں افعال ماضی کا ترجمہ مستقبل میں ہوگا اور اِذَا کی وجہ سے یہ تمام جملے شرط ہیں، جبکہ آیت۔14۔ میں عَلِمَتۡ نَفۡسٌ جواب شرط ہے اس لیے عَلِمَتۡ (ماضی) کا ترجمہ بھی مستقبل میں ہوگا۔ (آیت۔7) نُفُوۡسٌ جمع ہے نَفۡسٌ کی جس کے معنی ہیں ''سانس۔'' زندگی کا مدار سانس پر ہے اس لیے یہ جان کے لیے بھی آتا ہی اور جان والے یعنی شخص کے لیے بھی آتا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت کے دو طرح ترجمے کیے گئے ہیں۔ اول یہ کہ جانوں کو ان کے جسموں کے ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ دوم یہ کہ ہم خیال اور ایک جیسے عمل کرنے والے اشخاص کو ایک ساتھ جوڑ دیا جائے گا۔ ترجمہ میں ہم پہلی رائے کو ترجیح دیں گے۔ کیونکہ نَفۡسٌ سے اگر جان مراد ہو تو یہ لفظ مؤنث اور اگر شخص مراد ہو تو یہ مذکر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہاں زُوِّجَتۡ مؤنث کا صیغہ آیا ہے اس لیے پہلی رائے کو ترجیح دی گئی ہے۔

ترجمہ

اِذَا الشَّمۡسُ کُوِّرَتۡ ①	وَ اِذَا النُّجُوۡمُ انۡکَدَرَتۡ ②	وَ اِذَا الۡجِبَالُ سُیِّرَتۡ ③
جب سورج لپیٹ دیا جائے گا	اور جب تارے بکھر کر بے نور ہوجائیں گے	اور جب پہاڑ چلائے جائیں گے

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ ۝۴	وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ ۝۵ 1973
اور جب حاملہ اونٹنیاں چھوڑ دی جائیں گی	اور جب وحشی جانور اکٹھا کیے جائیں گے

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ ۝۶	وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ ۝۷
اور جب سمندر بھڑکائے جائیں گے	اور جب جانیں (جسموں سے) جوڑی جائیں گی

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝۸	بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹
اور جب زندہ دفن کی ہوئی سے پوچھا جائے گا	کس گناہ کے سبب سے وہ قتل کی گئی

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ ۝۱۰	وَاِذَا السَّمَاۗءُ كُشِطَتْ ۝۱۱
اور جب اوراق (اعمال نامے) کھولے جائیں گے	اور جب آسمان سے پردہ اتار لیا جائے گا

وَاِذَا الْجَحِيْمُ سُعِّرَتْ ۝۱۲	وَاِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ ۝۱۳	عَلِمَتْ نَفْسٌ	مَّآ اَحْضَرَتْ ۝۱۴
اور جب دوزخ بھڑکائی جائے گی	اور جب جنت نزدیک لائی جائے گی	تو جان لے گی (ہر) ایک جان	اس کو جو اس نے حاضر کیا

نوٹ:1

پچھلی دونوں سورتوں، النّٰزعٰت اور عَبَس میں جس حولِ قیامت سے ڈرایا گیا ہے، اس سورہ میں اسی حول قیامت کی پوری تصویر ہے۔ (تدبر قرآن)۔ پہلی آیت میں کُوِّرَتْ کا لفظ سورج کو بے نور کر دیئے جانے کے لیے ایک بے نظیر استعارہ ہے۔ عربی زبان میں تَکْوِیْر کے معنی لپیٹنے کے ہیں۔ سر پر امامہ (صافہ) باندھنے کے لیے تکویر العمامہ کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ کیونکہ عمامہ پھیلا ہوا ہوتا ہے اور پھر سر کے گرد اسے لپیٹا جاتا ہے۔ اسی مناسبت سے اس روشنی کو جو سورج سے نکل کر سارے عالم میں پھیلی ہوئی ہے، عمامہ سے تشبیہ دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ قیامت کے روز یہ پھیلا ہوا عمامہ سورج پر لپیٹ دیا جائے گا یعنی اس کی روشنی کا پھیلنا بند ہو جائے گا۔ (تفہیم القرآن)۔ ظاہر ہے کہ جب سورج کی بساط ہی لپیٹ دی جائے گی تو سارا عالم تاریک ہو جائے گا۔ اگرچہ سورج کے چھپنے کا مشاہدہ ہمیں آج بھی ہر روز ہوتا رہتا ہے لیکن اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ یہ صورت صرف اس وجہ سے پیش آتی ہے کہ ہم اس سے اُوٹ میں ہو جاتے ہیں۔ البتہ جب قیامت برپا ہو گی تو سورج کا سارا نظام ہی درہم برہم ہو جائے گا۔ کون اندازہ کر سکتا ہے اس تاریکی کا جب کہ سرے سے سورج ہی تاریک ہو جائے گا۔ (تدبر قرآن)۔

دوسری آیت میں بتایا ہے کہ باہمی کشش ثقل کی وہ بندش جس نے اجرامِ فلکی کو اپنے اپنے مدار پر باندھ رکھا ہے وہ کھل جائے گی اور سب تارے اور سیارے کائنات میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ اِنْکِدَار میں کدورت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صرف منتشر ہی نہیں ہوں گے بلکہ تاریک بھی ہو جائیں گے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:2

آیت۔4۔ میں حاملہ اونٹنی کو چھوڑ دینے کی بات عربوں کو قیامت کی سختی کا تصور دلانے کے لیے ایک بہترین طرز بیان ہے۔ موجودہ زمانے کے ٹرک اور بسیں چلنے سے پہلے اہل عرب کے لیے اس اونٹنی سے زیادہ قیمتی مال اور کوئی نہ تھا جو بچہ جننے کے قریب ہو۔ اس حالت میں اس کی بہت زیادہ حفاظت اور دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ایسی اونٹنیوں سے لوگوں کا غافل ہو جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ اس وقت کچھ ایسی سخت افتاد پڑے گی کہ انہیں اپنے عزیز ترین مال کی حفاظت کا بھی ہوش نہ رہے گا۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

آیت۔5۔ میں وحشی جانوروں کے اکٹھا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان تو انسان، اس دن کے حول سے وحشی جانوروں پر بھی ایسی دہشت

طاری ہوگی کہ ان کو جہاں بھی پناہ ملنے کی توقع ہوگی وہ سب وہیں اکٹھا ہو جائیں گے اور آپس کی فطری دشمنیاں بھول جائیں گے۔ جنگل میں آگ لگ جائے یا سیلاب آجائے تو جنگلی جانور جس ٹیلے پر پناہ ملے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اس آفت کا حول ان پر ایسا طاری ہوتا ہے کہ بکری، شیر اور بھیڑیے پاس پاس کھڑے ہوتے ہیں لیکن کسی کو ہوش نہیں رہتا کہ ان کا شکار ان کی بغل میں ہے۔ یہی صورتحال خوفناک ترین شکل میں ظُہورِ قیامت کے وقت پیش آئے گی۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:4

آیت۔6۔ میں سمندر کو بھڑکائے جانے کے یہ لفظ سُجِّرَتْ استعمال کیا گیا ہے جو تسجیر سے ماضی مجہول کا صیغہ ہے۔ تسجیر عربی زبان میں تندور کے اندر آگ بھڑکانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ بظاہر یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ قیامت کے روز سمندروں میں آگ بھڑک اٹھے گی۔ لیکن اگر پانی کی حقیقت نگاہ میں ہو تو اس میں کوئی چیز بھی قابل تعجب نہ رہے گی۔ یہ سراسر اللہ تعالیٰ کا معجزہ ہے کہ اس نے آکسیجن اور ہائیڈروجن دو ایسی گیسوں کو باہم ملایا جن میں سے ایک آگ بھڑکانے والی اور دوسری بھڑک اٹھنے والی ہے اور ان دونوں کی ترکیب سے پانی جیسا مادہ پیدا کیا جو آگ بجھانے والا ہے۔ اللہ کی قدرت کا ایک اشارہ اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ پانی کی اس ترکیب کو بدل ڈالے اور یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے الگ ہو کر بھڑکنے اور بھڑکانے میں مشغول ہو جائیں جو ان کی اصل بنیادی خاصیت ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:5

جاہلیت عرب میں یہ رسم تھی کہ لڑکی کو اپنے لیے موجب عار سمجھتے تھے اور اس کو زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام نے یہ رسم بد مٹائی۔

آیات۔8۔9۔ میں ہے کہ ایسی لڑکیوں سے پوچھا جائے گا۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قیامت تو نام ہی یوم الحساب اور یوم الجزاء کا ہے، اس میں تو ہر شخص سے اس کے تمام اعمال کے متعلق پوچھا جائے گا اس جگہ احوال قیامت کے سلسلہ میں زندہ دفن کی ہوئی لڑکی کے معاملے کو اتنی اہمیت کے ساتھ ذکر کرنے میں کیا حکمت ہے۔ غور کرنے سے اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو خود اس کے ماں باپ نے قتل کیا ہے۔ اس کے خون کا بدلہ لینے کے لیے اس کی طرف سے دعویٰ کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ چنانچہ حشر کے میدان میں جو عدالت الٰہیہ قائم ہوگی اس میں ایسے مظالم کو بھی سامنے لایا جائے گا جس کے ظلم پر نہ کوئی شہادت ہے نہ اس مظلوم کا کوئی پرسانِ حال ہے۔

قتل اولاد گناہ کبیرہ اور ظلم عظیم ہے۔ چار ماہ کے بعد کسی حمل کو گرانا بھی اسی حکم میں ہے کیونکہ چوتھے مہینے میں حمل میں روح پڑ جاتی ہے اور وہ زندہ انسان کے حکم میں ہوتا ہے۔ اور چار ماہ سے پہلے بھی اسقاط حمل، بدون اضطراری حالات کے، حرام ہے مگر پہلی صورت کی نسبت کم ہے کیونکہ اس میں کسی زندہ انسان کا قتل نہیں ہے۔

کوئی ایسی صورت اختیار کرنا جس سے حمل قرار نہ پائے، جیسے آج کل دنیا میں ضبط تولید (فیملی پلاننگ) کے نام سے اس کی مختلف صورتیں رائج ہوگئی ہیں اس کو بھی رسول اللہ ﷺ نے وَأْدٌ خفی فرمایا ہے یعنی خفیہ طور سے بچے کو دفن کر دینا۔ (مسلم، راوی حزامہ بنت وھب)۔ اور بعض دوسری روایات میں جو عزل یعنی ایسی تدبیر کرنا کہ نطفہ رحم میں نہ جائے، اس پر رسول اللہ ﷺ کی طرف سکوت یا عدم ممانعت منقول ہے وہ ضرورت کے مواقع کے ساتھ مخصوص ہے۔ وہ بھی اس طرح کہ ہمیشہ کے لیے قطع نسل کی صورت نہ بنے۔ آج کل ضبط تولید کے نام سے جو دوائیں یا علاج کیے جاتے ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں کہ ہمیشہ کے لیے نسل و اولاد کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اس کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے۔ (معارف القرآن)۔

فیملی پلاننگ کی مہم کے کارکنان عزل والی حدیث کا حوالہ دیتے ہیں لیکن وَأْدٌ خفی والی حدیث کو صاف پی جاتے ہیں۔ ایک مغرب زدہ دانشور صاحب کو میں نے اس دوسری حدیث کا حوالہ دیا تو فرمایا کہ یہ حدیث نہیں ہے کیونکہ یہ عزل والی حدیث کی ضد ہے اور اللہ

کے رسول (ﷺ) متضاد بات نہیں کر سکتے۔ احادیث ڈھائی سو سال کے بعد لکھی گئی ہیں اور یہ دوسری حدیث اس وقت 6973 کے کسی کٹھ ملا قسم کے تابعی نے اپنی طرف سے بڑھائی دی ہے۔ ان کے اس طرزِ عمل سے مجھے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ اول یہ کہ وَاُدْ خفی والی حدیث ان کے علم میں تھی۔ دوم یہ کہ وہ اپنی مہم کو کامیاب کرنے کی خواہش سے اس درجہ مغلوب ہو چکے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے دروازے انہوں نے اپنے اوپر بند کر لیے ہیں۔ ورنہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مرضی و منشا تلاش کرنے والوں کو ان احادیث کی تطبیق میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

اس بات کو یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سور کو حرام کیا ہے اور ساتھ ہی حالت اضطرار میں دو شرائط کے ساتھ سور کھانے کی رخصت بھی دی ہے۔ پہلی شرط ہے کہ سؤر کھاتے وقت اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے بغاوت کا جذبہ نہ ہو۔ دوم یہ کہ حد سے تجاوز نہ کرے یعنی اضطرار کو ختم کرنے کے لیے جتنا کھانا ضروری ہو اس سے زیادہ نہ کھائے۔ یہی صورتحال ان دونوں احادیث کی ہے کہ عمومی حکم تو یہی ہے کہ منع حمل کی تدابیر اختیار کرنا بچے کو خفیہ طور پر دفن کرنا ہے اور گناہ ہے۔ البتہ حالت اضطرار میں کسی مخصوص شخص کے لیے رخصت ہو گی لیکن وہ ہو گی انہیں دو شرائط کے ساتھ۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ فیملی پلاننگ کے لیے ایک محکمہ قائم کرنا، وقفہ وقفہ اس کے لیے مہم چلانا، اشتہارات کی بوچھاڑ کرنا، ہر سال اس کا یوم منانا، یہ سب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے خلاف کھلی بغاوت ہے اور حد سے تجاوز کرنا ہے۔ (مرتب)

آیت نمبر (15 تا 29)

خ ن س

(ن) خَنْسًا پیچھے ہٹنا۔ سکڑنا (لازم) پیچھے کرنا۔ سمیٹنا (متعدی)۔

خَانِسٌ ج خُنَّسٌ۔ پیچھے ہٹنے والا۔ سکڑنے والا۔ پیچھے کرنے والا۔ سمیٹنے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 81/التکویر:15۔

خَنَّاسٌ فَعَّالٌ کے وزن پر مبالغہ سے۔ بار بار پیچھے ہٹنے والا۔ بار بار سکڑنے والا۔ آیت۔ 114/الناس:4۔

ك ن س

(ن) كَنْوْسًا کسی کا اپنی پناہ گاہ میں پناہ لینا۔ دبک جانا۔

كَانِسٌ ج كُنَّسٌ۔ پناہ لینے والا۔ دبک جانے والا۔ زیر مطالعہ آیت۔ 16

ض ن ن

(ض) ضَنًّا بخل کرنا۔

ضَنِيْنٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر صفت ہے۔ بخل کرنے والا۔ بخیل زیر مطالعہ آیت۔ 24۔

ترکیب (آیت۔ 15 تا 18) بِالْخُنَّسِ کے حرف جَرّ بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے اَلْجَوَارِ اور اَلْكُنَّسِ حالت جر میں ہیں۔ وَالَّيْلِ اور وَالصُّبْحِ کی واو کو قسمیہ بھی مانا جا سکتا ہے اور عاطفہ بھی مانا جا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اَلَّيْلِ اور اَلصُّبْحِ کی جَرّ بِ پر عطف ہونے کی وجہ سے مانی جائے گی۔ ہم انہیں واؤ عاطفہ مان کر ترجمہ کریں گے۔ (آیت۔ 19) اِنَّهٗ میں هٗ کی ضمیر قرآن مجید کے لیے ہے۔ (آیت۔ 20۔21) ذِیْ قُوَّةٍ۔ مَكِيْنٍ۔ مُطَاعٍ اور اَمِيْنٍ، یہ سب رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ کی صفت ہونے کی وجہ سے حالت جَر میں ہیں اور

یہ صفات بتا رہی ہیں کہ گزشتہ آیت میں رَسُوْلٍ کَرِیْمٍ سے مراد حضرت جبریلؑ ہیں۔ (آیت۔23) لَقَدْ رَاٰهُ میں فعل رَاٰ میں شامل ضمیر فاعلی هُوَ رسول اللہ ﷺ کے لیے ہے، جبکہ اس کی ضمیر مفعولی حضرت جبریلؑ کے لیے ہے۔ جبکہ آیت۔25۔ میں هُوَ کی ضمیر قرآن مجید کے لیے ہے۔ (آیت۔28) لِمَنْ بدل ہے گزشتہ آیت میں لِلْعٰلَمِیْنَ کا۔ لیکن یہ بدل عام نہیں بلکہ بدل بعض ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ یہ بدل مخصوصہ ہے یعنی یہ بدل ان لوگوں کے لیے ہے جن کی خصوصیت آگے بیان ہوئی ہے۔ اردو میں بھی بدل بعض کا استعمال عام ہے۔ مثلاً ہم کہتے کہ انکم ٹیکس کے قوانین میں ہونے والی تبدیلیوں کو تمام ٹیکس دہندگان، خاص طور سے تنخواہ دار طبقہ اچھی طرح سمجھ لے۔ اسی طرح سے دونوں آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ قرآن مجید ایک یاددہانی ہے تمام جہانوں کے لیے خاص طور سے ان کے لیے جو یہ چاہتے ہیں۔

ترجمہ

فَلَآ اُقْسِمُ	بِالْخُنَّسِ ﴿۱۵﴾	الْجَوَارِ
پس نہیں! میں قسم کھاتا ہوں	پیچھے ہٹنے والوں (یعنی ستاروں) کی	چلنے والوں (یعنی سیاروں) کی

الْكُنَّسِ ﴿۱۶﴾	وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ﴿۱۷﴾	وَالصُّبْحِ	اِذَا تَنَفَّسَ ﴿۱۸﴾
چھپ جانے والوں (یعنی تاروں) کی	اور رات کی جب وہ گزر جائے	اور صبح کی	جب وہ سانس لے (یعنی روشن ہو)

اِنَّهٗ	لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ﴿۱۹﴾	ذِیْ قُوَّةٍ	عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ﴿۲۰﴾
بیشک یہ (قرآن)	یقیناً ایک بزرگ رسول (جبریلؑ) کا قول ہے	جو قوت والا ہے	عرش والے کے پاس رتبہ والا ہے

مُّطَاعٍ	ثَمَّ	اَمِيْنٍ ﴿۲۱﴾	وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ﴿۲۲﴾
اس کی اطاعت کی جاتی ہے	وہیں	امانتدار (بھی) ہے	اور تم لوگوں کے ساتھی مجنون نہیں ہیں

وَلَقَدْ رَاٰهُ	بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ﴿۲۳﴾	وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ﴿۲۴﴾
اور وہ یقیناً دیکھ چکے ہیں ان (جبریلؑ) کو	کھلے آسمان کے کنارے پر	اور وہ غیب (بتانے) پر کنجوسی کرنے والے نہیں ہیں

وَمَا هُوَ	بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ﴿۲۵﴾	فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ﴿۲۶﴾
اور نہیں ہے یہ (قرآن)	کسی مردود شیطان کا قول	تو تم لوگ کہاں (بھٹکنے) جاتے ہو

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ	لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۷﴾	لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ	اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ﴿۲۸﴾
نہیں ہے یہ (قرآن) مگر ایک یاددہانی	تمام جہانوں کے لیے	(خصوصاً) اس کے لیے جو چاہے تم میں سے	کہ وہ سیدھی راہ پر رہے

وَمَا تَشَآءُوْنَ	اِلَّآ اَنْ	يَّشَآءَ اللّٰهُ	رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۹﴾
اور تم لوگ کیا چاہو گے	سوائے اس کے کہ (جو)	چاہے گا اللہ	جو تمام جہانوں کا پالنہار ہے

نوٹ: 1 آیات۔15 تا 18۔ میں جو قسمیں کھائی گئی ہیں وہ جس بات پر کھائی گئی ہے وہ آگے کی آیات میں بیان کی گئی ہیں۔ مطلب اس قسم کا یہ ہے کہ

محمد ﷺ نے تاریکی میں کوئی خواب نہیں دیکھا ہے بلکہ جب تارے چھپ گئے تھے، رات رخصت ہوگئی تھی اور روشن صبح نمودار ہوگئی تھی، اس وقت کھلے آسمان پر انہوں نے خدا کے فرشتے کو دیکھا تھا۔ اس لیے وہ جو کچھ بیان کر رہے ہیں وہ پورے ہوش گوش کے ساتھ دن کی روشنی میں پیش آنے والے تجربے پر مبنی ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

ان قسموں کی مناسبت آئندہ مضمون سے یہ ہے کہ ان ستاروں کا چلنا، ٹھہرنا اور چھپ جانا ایک نمونہ ہے سابقہ انبیاء پر وحی آنے، اور ایک مدت تک ان کے نشان باقی رہنے، پھر منقطع ہو کر غائب ہو جانے کا۔ اور رات کا آنا نمونہ ہے اس تاریک دور کا جو خاتم المرسلین ﷺ کی ولادت باسعادت سے پہلے دنیا پر گزرا کہ حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی اور وحی کے آثار بالکل مٹ چکے تھے۔ (یہ دور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع آسمانی کے بعد سے تقریباً چھ سو سال کا عرصہ ہے جب نزول وحی کا سلسلہ منقطع رہا۔ مرتب) اس کے بعد صبح کا دم بھرنا، حضور ﷺ کا اس جہاں میں تشریف لانا اور قرآن کا اترنا ہے کہ ہر چیز کو ہدایت کے نور سے دن کے مانند روشن کر دیا گویا سابقہ انبیاء کا نور ستاروں کی طرح تھا اور اس نورِ اعظم (یعنی قرآن) کو آفتاب کہنا چاہیے۔ اور بعض علماء نے فرمایا کہ چلنا، لوٹنا اور چھپ جانا، فرشتے کے آنے، واپس جانے اور عالم ملکوت میں چھپنے کے مشابہ ہے۔ اور رات کا گزرنا اور صبح کا آنا، قرآن کے سبب سے ظلمت کفر دور ہو جانے اور نورِ ہدایت کے پوری طرح ظاہر ہو جانے کے مشابہ ہے۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

نوٹ:2

آیات۔20۔21۔ میں حضرت جبریلؑ کی مزید صفات بیان کی گئی ہیں تاکہ اچھی طرح واضح ہو جائے کہ قرآن کس محفوظ و مامون اور پاکیزہ ذریعہ سے اترا ہوا کلام ہے۔ مطاع یعنی جو فرشتے ان کی ماتحتی میں ہیں وہ سب بے چوں و چرا ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ مجال نہیں ہے کہ سر مو ان کے احکام سے انحراف کر سکیں، ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکیں یا ان کے دیئے ہوئے احکام میں تحریف یا ترمیم کر سکیں۔

ثَمَّ اَمِیۡن۔ یہاں ثُمَّ نہیں بلکہ ثَمَّ آیا ہے۔ ان دونوں کے استعمال میں فرق ہے۔ ثَمَّ کسی جگہ کی طرف خاص طور پر اشارے کے لیے بھی آتا ہے اور کسی صفت سے پہلے اس پر اہتمام سے زور دینے کے لیے بھی۔ یہاں یہ صفت امین سے پہلے آیا ہے۔ اس سے مقصود حضرت جبریلؑ کی اس صفت کی طرف خاص طور پر توجہ دلانا ہے۔ یعنی مذکورہ صفات کے ساتھ ان کی خاص اہمیت رکھنے والی صفت یہ بھی ہے کہ وہ امانتدار ہیں۔ اس صفت کا خاص اہتمام سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی یہی صفت اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے رسول ﷺ کے پاس جو کچھ لاتے ہیں اس میں کسی ملاوٹ یا کسی کمی بیشی کا کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

سورۃ الانفطار(82)

آیت نمبر(1تا8)

ب ع ث ر

(رباعی) بَعۡثَرَۃً کسی چیز کو الٹنا پلٹنا۔ کریدنا۔ اس میں سے کچھ نکالنے کے لیے۔ یُعۡثِرَ ماضی مجہول ہے۔ کریدا جانا۔ ﴿ اِذَا بُعۡثِرَ مَا فِی الۡقُبُوۡرِ ۙ﴾ (100/العٰدیٰت:9) ''جب کریدا جائے گا اس کو جو قبروں میں ہے۔''

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝۱	وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝۲	وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝۳
جب آسمان پھٹ جائے گا	اور جب ستارے جھڑ جائیں گے	اور جب سمندر پھاڑ دیئے جائیں گے

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝۴	عَلِمَتْ نَفْسٌ	مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵
اور جب قبریں ادھیڑ دی جائیں گی	تو جان لے گی ہر ایک جان اس کو	اس نے جو آگے کیا اور جو پیچھے کیا

يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ	بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝۶	الَّذِيْ خَلَقَكَ
اے انسان کس چیز نے دھوکے میں ڈالا تجھ کو	تیرے کریم رب کے بارے میں	وہ جس نے پیدا کیا تجھ کو

فَسَوّٰىكَ	فَعَدَلَكَ ۝۷	فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ	مَّا	شَآءَ	رَكَّبَكَ ۝۸
پھر اس نے نوک پلک درست کی تیری	پھر اس نے متناسب کیا تجھ کو	جس صورت میں	جو (جیسا)	اس نے چاہا	اس نے ترتیب دیا تجھ کو

نوٹ:1

ظہور قیامت کے وقت آسمان کے پھٹ جانے کا ذکر قرآن میں جگہ جگہ ہوا۔ دراصل قیامت کے بعد ایک بالکل نیا عالم نئے قوانین کے تحت ظہور میں آئے گا، اس وجہ سے اس عالم کہن کی ہر چیز ٹوٹ پھوٹ جائے گی۔ اس ٹوٹ پھوٹ کی شکل کیا ہوگی، اس کا صحیح تصور آج نہیں کیا جا سکتا لیکن اس کی یاد دہانی اس لیے فرمائی گئی ہے کہ لوگوں کو جھنجوڑا جائے کہ قیامت کی ہلچل ایسی ہوگی کہ یہ محکم چھت (یعنی آسمان) جس میں تم ڈھونڈے سے بھی کوئی رخنہ نہیں پا سکتے، بالکل رخنہ ہی رخنہ اور شگاف ہی شگاف بن کر رہ جائے گی۔ یہاں اس الجھن میں اپنے دماغ کو مت ڈالیئے کہ یہ آسمان جو ہمیں نظر آتا ہے، یہ محض ایک خلا ہے یا کوئی ٹھوس چیز ہے، بلکہ اس بات پر یقین رکھیں کہ جس طرح آج اس کا مشاہدہ ہم ایک محکم چھت کی شکل میں کر رہے ہیں، اسی طرح قیامت کی ہلچل کے وقت اس میں شگاف ہی شگاف نظر آئیں گے۔ (تدبر قرآن)۔

نوٹ:2

سورۂ تکویر میں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں میں آگ بھڑکا دی جائے گی اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ سمندروں کو پھاڑ دیا جائے گا۔ دونوں آیتوں کو ملا کر دیکھا جائے، اور یہ بات بھی نگاہ میں رکھی جائے کہ قرآن کی رو سے قیامت کے روز ایک ایسا زبردست زلزلہ آئے گا جو کسی علاقہ تک محدود نہیں ہوگا بلکہ پوری زمین بیک وقت ہلا ماری جائے گی، تو سمندروں کے پھٹنے اور ان میں آگ بھڑک اٹھنے کی کیفیت ہماری سمجھ میں یہ آتی ہے کہ پہلے اس عظیم زلزلے کی وجہ سے سمندروں کی تہ پھٹ جائے گی اور ان کا پانی زمین کے اس اندرونی حصے میں اترنے لگے گا جہاں ہر وقت ایک بے انتہا گرم لاوا کھولتا رہتا ہے۔ پھر اس لاوے تک پہنچ کر پانی اپنے دو ابتدائی اجزاء کی شکل میں تحلیل ہو جائے گا جن میں سے ایک آکسیجن جلانے والی ہے اور دوسری ہائیڈروجن بھڑک اٹھنے والی ہے یوں تحلیل اور آتش افروزی کا ایک ایسا مسلسل ردعمل (Chain Reaction) شروع ہو جائے گا جس سے دنیا کے تمام سمندروں میں آگ لگ جائے گی۔ یہ ہمارا قیاس ہے باقی صحیح علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ:3

جب قیامت کے وہ حالات پیش آ چکیں گے جن کا ذکر شروع سورت میں کیا گیا ہے اس وقت ہر انسان جان لے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔ آگے بھیجنے سے مراد اس پر عمل کر لینا ہے اور پیچھے چھوڑنے سے مراد ترکِ عمل ہے۔ تو قیامت کے روز ہر شخص جان لے گا کہ اس نے نیک و بد کیا کیا عمل کر لیے اور نیکی و بدی میں سے کیا چھوڑ دی تھی۔ اور یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ آگے بھیجے ہوئے اعمال سے مراد وہ عمل

ہوں جو اس نے خود کیے، خواہ نیک ہوں یا بد، اور پیچھے چھوڑے ہوئے سے مراد وہ عمل ہوں جن کی رسم دنیا میں ڈال گئے۔ اگر وہ نیک کام ہیں تو ان کا ثواب اس کو ملتا رہے گا اور برے ہیں تو اس کی برائی اس کے نامہ اعمال میں لکھی جاتی رہے گی۔ جیسا کہ حدیث میں 6973 ہے کہ جس شخص نے اسلام میں کوئی بھی سنت اور طریقہ جاری کرایا اس کا ثواب ہمیشہ اس کو ملتا رہے گا۔ اور جس نے کوئی بری رسم دنیا میں جاری کیا تو جب تک لوگ اس بُرے کام میں مبتلا ہوں گے اس کا گناہ اس شخص کے لیے بھی لکھا جاتا رہے گا۔ (معارف القرآن)۔

نوٹ: 4

آیت۔6۔ کا مطلب یہ ہے کہ وہ رب کریم کیا اس کا حقدار تھا کہ اس کے حلم پر مغرور ہو کر تو نافرمانیاں کرتا رہے اور اس کے لطف و کرم کا جواب کفر و طغیان سے دے۔ اس کا کرم دیکھ کر تو اور زیادہ شرمانا اور حلیم کے غصے سے بہت زیادہ ڈرنا چاہے تھا۔ بیشک وہ کریم ہے لیکن منتقم اور حکیم بھی ہے۔ پھر یہ دھوکا نہیں تو اور کیا ہے کہ اس کی ایک صفت کو لے کر دوسری صفات سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

اس دھوکے میں پڑنے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے۔ تیرا وجود خود بتا رہا ہے کہ تو خود نہیں بن گیا ہے، تیرے ماں باپ نے بھی تجھے نہیں بنایا ہے، عناصر کے آپ سے آپ جڑ جانے سے بھی اتفاقاً تو انسان بن کر پیدا نہیں ہو گیا ہے، بلکہ ایک خدائے حکیم و توانا نے تجھے اس مکمل انسانی شکل میں ترتیب دیا ہے۔ تیرے سامنے ہر قسم کے جانور موجود ہیں جن کے مقابلے میں تیری بہترین ساخت اور تیری افضل و اشرف قوتیں صاف نمایاں ہیں۔ عقل کا تقاضہ یہ تھا کہ اس کو دیکھ کر تیرا سر بار احسان سے جھک جاتا اور اس رب کریم کے مقابلے میں تو کبھی نافرمانی کی جرأت نہ کرتا۔ تو خود جب کسی کا افسر ہوتا ہے تو اپنے اس ماتحت کو کمینہ سمجھتا ہے جو تیرے شرافت اور نرم دلی کو کمزوری سمجھ کر تیرے سر پر چڑھ جائے۔ اس لیے تیری اپنی فطرت یہ گواہی دینے کے لیے کافی ہے کہ مالک کا کرم ہرگز اس کا موجب نہ ہونا چاہیے کہ بندہ اس کے مقابلے میں جری ہو جائے۔ (تفہیم القرآن)۔

نوٹ: 5

آیت۔8۔ کا مطلب یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ تخلیق سب انسانوں کی ایک خاص وضع اور ہیئت پر ہونے کی وجہ سے سب میں اشتراک ہے، اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ سب ایک ہی شکل و صورت کے ہوتے، مگر حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ نے کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کی شکل و صورت میں ایسے امتیازات پیدا فرما دیئے جو ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہوتے بلکہ صاف اور نمایاں امتیاز رہتا ہے۔ (معارف القرآن)۔

آیت نمبر (9تا19)

ترکیب

(آیت۔10) اِنَّ کا اسم ہونے کی وجہ سے حٰفِظِیْنَ حالت نصب میں ہے اس کی خبر محذوف ہے۔ عَلَیْکُمْ قائم مقام خبر ہے۔ لَحٰفِظِیْنَ پر لام تاکید ہے۔ لام تاکید عموماً اِنَّ کی خبر پر آتا ہے۔ لیکن خبر محذوف ہو تو اِنَّ کے اسم پر لے آتے ہیں۔ (آیت۔ 11) کِرَامًا اور کَاتِبِیْنَ، یہ دونوں حٰفِظِیْنَ کا بدل ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ (آیت۔13۔14) اَلْاَبْرَارَ اور اَلْفُجَّارَ، یہ دونوں اِنَّ کے اسم ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں ہیں۔ ان کی خبریں محذوف ہیں۔ فِیْ نَعِیْمٍ اور فِیْ جَحِیْمٍ قائم مقام خبریں ہیں۔ جن پر لام تاکید ہے۔

ترجمہ 6973

كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۙ﴿۹﴾	وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ ۙ﴿۱۰﴾
ہرگز نہیں! بلکہ تم لوگ جھٹلاتے ہو بدلے (جزاوسزا) کو	اور بیشک تم لوگوں پر یقیناً محفوظ کرنے والے (مقرر) ہیں

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ ۙ﴿۱۱﴾	يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۱۲﴾	اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ۚ﴿۱۳﴾
جومعزز ہیں، لکھنے والے ہیں	وہ جانتے ہیں اس کو جوتم لوگ کرتے ہو	بیشک نیک لوگ یقیناً دائمی خوشحالی میں ہیں

وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ ۚۖ﴿۱۴﴾	يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ﴿۱۵﴾
اور بیشک نافرمانی کرنے والے یقیناً جہنم میں ہیں	وہ لوگ کریں گے اس میں بدلے کے دن

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ ﴿۱۶﴾	وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۙ﴿۱۷﴾
اور وہ لوگ اس (جہنم) سے چھپنے والے نہیں ہیں	اور تو کیا جانے کیا ہے بدلے کا دن

ثُمَّ	مَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ ﴿۱۸﴾	يَوْمَ لَا تَمْلِكُ	نَفْسٌ لِّنَفْسٍ
پھر (مکرر)	تو کیا جانے کیا ہے بدلے کا دن	جس دن اختیار نہ رکھے گی	کوئی جان کسی جان کے لیے

شَيْـًٔا ؕ	وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ	لِّلّٰهِ ﴿۱۹﴾
کسی چیز کا	اور سارے معاملات اس دن	اللہ کے لیے ہوں گے

نوٹ: 1

آیت۔10۔12۔کا مطلب یہ ہے کہ اس مغالطہ میں نہ رہنا کہ تمہاری جلوت وخلوت کی ساری باتوں سے کون باخبر ہوسکتا ہے کہ ایک دن ان کا محاسبہ کرنے بیٹھے۔جان لو کہ اللہ تعالیٰ نے تم میں سے ہر ایک کے اوپر اپنے نگراں بیٹھا رکھے ہیں جو تمہارے ہر قول وفعل کو نوٹ کر رہے ہیں۔ساتھ ہی وہ نہایت معزز ہیں۔ان فرشتوں کی صفت کِرَامًا، سے مقصود اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ یہ جس ڈیوٹی پر مامور ہیں اس کو نہایت فرض شناسی، پورے احساس ذمہ داری اور کامل غیر جانبداری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں۔اور جو کچھ تم کرتے ہو اور جہاں کہیں بھی کرتے ہو، وہ سب ان پر واضح ہوتا ہے۔یہاں صرف افعال کے جاننے کا ذکر ہے لیکن سورہ ق آیت۔18۔میں فرمایا نہیں بولتا ہے وہ کوئی بات مگر ایک مستعد نگراں اس کے پاس موجود ہوتا ہے۔'' سورہ ق میں یہ وضاحت بھی ہے کہ یہ فرشتے دو ہوتے ہیں اور دائیں بائیں دونوں طرف سے نگرانی کرتے ہیں۔احادیث سے یہ حقیقت بھی واضح ہے کہ ان میں تقسیم کار ہوتی ہے۔ایک نیکیاں لکھنے پر مامور ہوتا ہے اور دوسرا بدیاں لکھنے پر (تدبر قرآن)۔

ان فرشتوں کا مرتب کردہ ریکارڈ ایک مکمل ریکارڈ ہے جس میں درج ہونے سے کوئی بات رہ نہیں گئی ہے۔اسی کے متعلق سورۂ کہف کی آیت۔49 میں فرمایا گیا ہے کہ قیامت کے روز مجرمین یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ ان کا جو نامۂ اعمال پیش کیا جا رہا ہے اس میں کوئی چھوٹی یا بڑی بات درج ہونے سے رہ نہیں گئی ہے، جو کچھ انہوں نے کیا تھا سب کا سب جوں کا توں ان کے سامنے حاضر ہے۔
(تفہیم القرآن)۔